معیار
The
Meyar
Monthly
Firozi 54

ترتیب دینے والے

نجم الاسلام | بدر فاروقی - ایم - اے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیصلی لائن جیکب آباد

ترتیب

نظمیں

مقالے اور مضامین

غزلیں

افسانے

خطوط و نکات

خیال اپنا اپنا

نقشِ اوّل

تعمیری ادب کی تحریک نے عالمی ادب کو کئی نئی اصطلاحیں دی ہیں۔ یا اگر وہ پہلے سے موجود تھیں تو ان میں نئے اور جاندار معانی ڈال کر انہیں نئی زندگی بخشی ہے ان کی صحیح حیثیت کو نکھارا ہے۔ ان کے دھندلے پس منظر کو ایک صاف شفاف تعمیری تاریخ سے جگمگایا ہے۔ ان کے فلسفیانہ پہلوؤں کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اب یہ ہرگز ممکن نہیں ہو سکتا کہ جو شخص تعمیری ادب اور اسلامی ادب سے واقف ہو چکا ہے وہ ان اصطلاحوں کو سکران کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ رہے اور اس تحریک کو نظر انداز کر دے جو انہیں تعمیری ادب کی تحریک کے اثر سے حاصل ہو گئی ہے۔ ابھی تک اس تحریک کا دائرہ اردو تک محدود ہے۔ اس نے مغربی ادیبوں اور نقادوں کو تو چھوڑ دیجئے ہاں کم سے کم اردو داں حلقہ میں ان اصطلاحات کی اہمیت واضح ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ آگے چل کر جب ہمیں مختلف زبانوں میں کام کرنے کے مواقع ملیں گے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہومات عالمگیر پیمانے پر بھی مقبول ہو جائیں۔

"تعمیر پسندی" ہی کو لیجئے۔ یہ اصطلاح اسلامی ادب کی تحریک سے پہلے موجود ضرور تھی لیکن اردو میں نہیں مغربی ادب میں۔ اردو میں اس کا استعمال ایک بالکل معمولی لفظ کے طور پر کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ عموماً یہ معنی وابستہ سمجھے جاتے تھے کہ یہ فقط تخریبی عمل، توڑ پھوڑ، اکھاڑ پچھاڑ کی ضد ہے۔ اس میں اصلاحی پہلو ہے اور بس۔ اور معانی بھی صرف لفظ تعمیر کے ساتھ وابستہ تھے۔ ترقی پسندوں نے ہمیشہ ترقی پر اکتفا کیا۔ اس لفظ کے استعمال پر زور نہیں دیا دراصل یہ لفظ ان کے طرز عمل سے زیادہ مناسبت بھی نہیں رکھتا تھا مغربی ادب و تنقید میں یہ لفظ البتہ ضرور پایا جاتا ہے۔ 'CONSTRUCTIVISM' کے نام سے ہمیں ایک اصطلاح مغربی بالخصوص روسی ادب میں ملتی ہے۔ دراصل یہ اصطلاح بعض روسی ادیبوں ہی نے ۱۹۲۴ء میں استعمال کرنی چاہی تھی لیکن انہیں اس لفظ کو عام کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کے نظریاتی پہلو پر تمام زور دینے کے بجائے اسے بعض ایسے پہلوؤں سے متعلق کر دیا جو فنی تھے اور اسٹیج کی ترقی سے وابستہ تھے۔

سوویت ادبی فنکاروں کے اس محدود گروپ نے جس کی تشکیل ۱۹۲۳ء میں ہوئی تھی اس اصطلاح کے تحت ادبی تخلیقات کے نظریاتی پہلو کو جدید ترقی پذیر فنی پہلوؤں سے آمیز کرنے کی کوشش کی۔ نظریاتی پہلو کا ذکر شاید اس لئے دینا ضروری سمجھا گیا کہ اس وقت بھی آج کی طرح ہر چیز کو سوویٹ رنگ میں رنگنے کی کوشش زوروں پر تھی اور اصل مقصد جو تھا وہ یہ تھا کہ فنی پہلوؤں پر زور دیا جائے بالخصوص روانی، اختصار اور گنجائش پر۔ یہ تحریک یعنی CONSTRUCTIVISM اس وقت اس دعوے کے ساتھ اٹھی کہ یہ موضوع کے انتہائی ارتقا کا ایک پورا انتظام ہے۔ مگر اس کی تخلیق زیادہ تر اسٹیج کی ترقی سے متعلق رہی جس سے واضح ہے کہ اس اصطلاح کے داعیین کے سامنے کوئی وسیع تر مقصد نہ تھا۔ اس ادبی گروپ نے فقط اتنا کیا کہ ترتیب غیر نمایندہ قسم کی تھی۔ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائے جا سکنے والے پلیٹ فارموں سیڑھیوں اور ڈھانچوں کو رواج دیا جا۔ جو گھر، فیکٹری یا اسٹیج کے نئے سطح کا کام دے سکیں۔ [DICT OF LIT. TERMS BY Shipley]

ظاہر ہے کہ اگر اس اصطلاح کے ساتھ اتنا ہی مفہوم وابستہ ہو تو یہ کوئی اونچی چیز نہیں اس تاریخی حوالے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعمیری ادب کی تحریک سے پہلے جن معنوں میں بھی تعمیر پسندی یا CONSTRUCTIVISM کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ نہایت محدود رہے ان میں نظریات و رجحانات کے وسیع تر مفہوم کو پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں دی گئی۔ یہ تعمیری ادب کی تحریک ہے جس نے اس کے حدود کو وسعت دے کر اس میں ادبی نظریہ کی ایک نئی دنیا آباد کر دی۔ ایک نئے عالم کی طرح ڈال دی۔ یہ طرح نو اسلام کا آفاقی نظریہ ہے۔ اس طرح نو برادب اور تعمیر کی جو عمارت تعمیر پسند حضرات بنا رہے ہیں وہ یقیناً پائیدار ثابت ہوگی۔ اور ایک مثال کا کام دے گی۔ ادیبوں اور فنکاروں میں ایک نئی زندگی کا احساس پیدا کرے گی۔ انہیں اسلام کے نظریہ ادب سے قریب تر لاکر تخلیقی قوتوں کو صحیح راہ پر لگا دے گی۔ ان خوشگوار تبدیلیوں کو جو سماج کی نئی تعمیر کے لئے ضروری ہیں — ان تمام اخلاقی پابندیوں کو جن کا اسلامی افکار ہم سے مطالبہ کرتے ہیں — اور ان سب اصلاحی اور زندگی بخش جذباتِ عمل کو جو اسلام کی بنیاد ہیں اور ہمیں ایک انسانی رجحان دیتے ہیں — ہم اگر ایک لفظ سے تعبیر کرنا چاہیں تو "تعمیر پسندی" پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ اصطلاح اب اپنے نئے معانی کے لحاظ سے فنی نہیں بلکہ نظریاتی ہے۔ اور ایک پوری تحریک کی نمایندگی کرتی ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعمیر پسندی کے لغوی معنی اسلامی فکر کے مفہوم سے خالی ہیں وہ بے شک اپنی جگہ ایسا ہی سمجھتے رہیں کیونکہ ان کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے آخر وہ پس منظر کیسے مٹ جائے گا جسے سیکڑوں دماغ اپنی تمام تر تخلیقی اور تعمیری قوتوں سے واضح طور پر بنا چکے ہیں اور بنا رہے ہیں۔

اسلامی ادب کی اصطلاح بھی ادبی حلقوں کے لئے نئی ہے بعض لوگ جو اسلامی ادب کی تحریک سے اب تک بالکل ناآشنا ہیں۔ اس کو مذہبی مسائل سے متعلق سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کا دار ومدار اسلام کے اس تصور پر ہے جو وہ اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں۔ جو لوگ اسلام کو فرقہ پرستوں کا مذہب سمجھتے ہیں وہ اسلامی ادب کو شاید اس سے بھی زیادہ تنگ نظری کے ساتھ دیکھیں لیکن جو لوگ جانتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی نظریہ کا نام ہے۔ ایک وسیع نظام فکر ہے۔ وہ چاہے اسلام سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن کبھی اسلامی ادب کے نام سے چونکیں گے نہیں۔ اس کی مثال اقبال سے دی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ اقبال کو فرقہ پرست ادیب بھی کہتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اسلام سے اختلاف رکھنے کے باوجود نہایت واضح طور سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اقبال نے اسلام کا جو نظریہ اپنے کلام میں پیش کیا ہے وہ آفاقی ہے اور اگر وہ ہندی مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنانے کے بجائے صرف اپنے محلے کے لوگوں کو اپنا مخاطب سمجھ کر بھی شعر کی تخلیق کرتے۔ تب بھی صرف مخاطبت کی وجہ سے پیام محدود نہ ہوتا بلکہ آفاقی ہی رہتا۔

غرض اسلامی ادب کے مفہوم کا سارا دار ومدار اسلام کے تصور پر ہے۔ اسلامی ادیبوں نے اقبال کی طرح اسلام کے آفاقی تصور کو اپنایا ہے بلکہ ایک خیالات تو وہ نظریاتی وضاحت کے معاملے میں اقبال سے آگے ہیں کیونکہ وہ کسی طرح کی ایسی ذہنی الجھن سے دوچار نہیں ہیں جیسی الجھن سے اقبال کو وطنیت سے اسلام کے آفاقی تصور تک آنے میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان کا فکری مقام واضح ہے۔ اس لئے جس اصطلاح کو یہ ادیب عام کر رہے ہیں وہ اپنے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے رہے گی۔ جو لوگ ابھی اس اصطلاح سے چونکتے ہیں کل وہی جب اس کے وسیع مفہوم سے متعارف ہو چکے ہوں گے تو ان کے چونکنے کا موقع پیش نہ آئے گا۔ اب بھی ادبی حلقوں میں یہ لفظ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ اور آگے چل کر اس کے مفہوم سے سب آشنا ہو جائیں گے۔ اس وقت یہی لفظ ہو گا جو اپنے اندر ایک پوری ادبی تاریخ ایک پوری ادبی تحریک ایک پورا فلسفہ سمیٹے ہوئے زبانوں پر آیا کرے گا۔ اور عام لوگ تب اس کی اہمیت کو سمجھ جائیں گے۔

اس مرتبہ معیار میں کلام غالب کی ایک نئی شرح شائع کی جا رہی ہے۔ یہ شرح منظور احسن صاحب عباسی کے قلم کی رہین منت اور موصوف کے طویل علمی تجربہ کا حاصل ہے۔ اس کی خصوصیت خاصہ اس کا اختصار ہے۔ جس نے کہیں بھی ابہام کی صورت اختیار نہیں کی ہے۔ اختصار کے باوجود شرح اپنی جگہ واضح ہے۔ اور شارح کے شیوۂ کار آگہی کو ظاہر کرتی ہے

امید ہے کہ عام حلقوں میں پسند کی جائے گی۔ اہلِ نظر اس کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ شارح کا منشا بھی یہی ہے کہ اس کے بارے میں اہل نقد و بصر اپنی رائے کا اظہار کریں اس لئے قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی رائے سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

رہی اس کی عام افادیت تو ہم اس کی طرف سے بھی مطمئن ہیں۔ غالب کی شرحوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ ایک رسالہ میں کسی ایسی شرح کی اشاعت، جو اپنے انداز بیان کا منفرد رنگ لئے ہوئے ہے یقیناً مفید رہے گی۔ ایسی کوشش ایک عظیم کلاسیکی شاعر کو یاد دلا کر عام ادبی حلقوں اور نئے آنے والوں کے لئے رہنمائی کا بہت سا سامان بہم پہنچائے گی۔ خصوصاً آج کے دور میں تو اس کی افادیت بہت زیادہ ہے جبکہ بعض غیر متوازن ادبی تحریکوں کے اثر سے کلاسیکل ادب سے ہماری واقفیت اور ہماری دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ممکن ہے اس میں اس بات کو بھی دخل ہو کہ ہمارا معیار تعلیم دن بدن گر رہا ہے۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات غالب کو اپنی ذہنی سطح سے کہیں زیادہ اونچا سمجھ کر محض اس کی گاہ بگاہ تعریف پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور خود کو گہرے مطالعہ سے بے نیاز کر لیتے ہیں۔ ایسے میں شرح کچھ نہ کچھ مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

تنویر احمد علوی

آئن سٹائن

یہ تیرے فکر و نظر کی بلندیوں کا شکوہ
زمیں پہ جس نے نئے آسماں بنائے ہیں
یہ تیرے ہوش و خرد جن کی رہنمائی نے
نئے طریق نئے کارواں بنائے ہیں

ترے خیال کا فانوس جب ہوا روشن
نظام کہنۂ عالم میں وہ کشش نہ رہی
تری نگاہ سے بدلا یہ میکدے کا نظام
کہ دورِ ساغر و مینا کی وہ روش نہ رہی

یہ تیرا فکر ہے ہستی کے ساز کے پردے
کہ جو ہیں تار بھی مضراب بھی ترنم بھی
یہ نظریاتِ اضافیت و مسافتِ وقت
کہ جن کی زد میں ہیں ذرہ بھی ماہ و انجم بھی

ترے نفس سے فسونِ آب و گل کا ٹوٹ گیا
بدل گئی یہ فضا زیست کے فسانے کی
یہ تیری روشنیٔ طبع یہ نئی تحقیق
کلید ہے کہ جسے ایٹمی زمانے کی

یہ جزوِ لایتجزّا یہ ذرّۂ ناچیز
ہیں بجلیوں کے نشیمن اس آبگینے میں
محیطِ زیست کا یہ قطرۂ تنک مایہ
کسے خبر تھی کہ طوفاں ہیں اس کے سینہ میں

بھری ہے شیشۂ شبنم میں آتشِ سیّال
شرار و شعلہ ہیں پنہاں گل و سمن میں بھی
تری نگاہ نے ثابت کیا زمانے پر
کہ آفتاب ہیں ذرّوں کے پیرہن میں بھی

یہ انکشافِ حقیقت عظیم تر ہی سہی
مگر حقیقتِ اعلیٰ کو کس نے دیکھا ہے
نظارہ سوز ہے بیشک یہ جلوۂ صورت
جمالِ شاہدِ معنیٰ کو کس نے دیکھا ہے

یہ مادّہ یہ انرجی یہ برق و کاہ ربا
یہ زندگی کہ بہر نوع پیچ و تاب میں ہے
یہ خود ہے کوزہ و کوزہ گر و گلِ کوزہ
کہ پردہ گیر کوئی اور اس نقاب میں ہے

خلوص تھا ترے علم و یقیں کی دنیا میں
رہی ہمیشہ صداقت کی جستجو تجھ کو
تری نگاہ سے ٹوٹا طلسم رنگِ مجاز
کہ تھی مشاہدۂ حق کی آرزو تجھ کو

وہ علم جس سے فروزاں ہوں زندگی کے چراغ
قیاس و وہم و گماں کے سوا کچھ اور بھی ہے
یہ کائنات یہ تنظیم ثابت و سیار
فقط زمین و زماں کے سوا کچھ اور بھی ہے

رہینِ شانہ کو مشاطگی بھی ہے درکار
عروس فکر کی زلفیں سنوارنے کیلئے
صبا کو صبح کے جلوؤں کی بھی ضرورت ہے
چمن کے پھولوں کی رنگت نکھارنے کیلئے

تو آج ایک حقیقت بھی ہے فسانہ بھی
کہ حق سے دور ہے، حق کی تجھے تلاش بھی ہے
ہے تیرا معجزۂ فکر ایک سحر حلال
کہ بت شکن بھی ہے تو اور بت تراش بھی ہے

شمع

فاروق بانسپاری

شمع سوزاں آج دل میں اضطرابِ غم ہے کیوں — محفلِ عشرت میں وقفِ گریۂ پیہم ہے کیوں

پیکرِ غم مجھ کو وجہِ اشک افشانی بتا — گر رہا ہے آگ کے شعلے سے کیوں پانی بتا

تیری خاموشی میں پنہاں اک جہانِ آہ ہے — کیا مآلِ زندگی سے دل ترا آگاہ ہے

کہہ رہا ہے اضطرابِ دود تیرے دل کا راز — منکشف پردے کی پرچھائیں سے ہے محمل کا راز

موجبِ ہنگامۂ محفل ہے خاموشی تری — دیدنی ہے بزم میں شانِ وفا کوشی تری

کیا خبر اس کو جو رمزِ عشق سے بیگانہ ہے
لَو تری لرزاں ہے یا مضطر دلِ پروانہ ہے

فخرِ شرکت دے مجھے بھی اس غمِ جانکاہ میں — ہمسفر ہوں میں بھی تیرا زندگی کی راہ میں

تجھ کو قدرت نے ہے تاجِ شعلۂ مضطر دیا — چشمِ پرنم کو مری گنجینۂ گوہر دیا

تیری پیشانی ہے روشن تیرگیٔ شام سے — روشنی ملتی ہے مجھ کو ظلمتِ ایام سے

خونِ دل کے فیض سے محفل میں ہے تو سرخرو — داغِ ناکامی ہے میرے آئینے کی آبرو

گل ترے شعلے میں ہو جاتا ہے پیدا دود سے — پھول کھل اٹھتے ہیں میرے آتشِ نمرود سے

کوہِ غم سر پر اٹھائے تو بحالِ زار ہے
میرے دوشِ ناتواں پر دو جہاں کا بار ہے

ایک ہے ہر چند ہم دونوں کی راہِ زندگی — مختلف لیکن ہے مقصودِ نگاہِ زندگی

جائے شاہیں اور ہے کرگس کی منزل اور ہے — جس کے اندر ہے مری لیلیٰ وہ محمل اور ہے

چل رہی ہے تو مگر واقف نہیں اِس راز سے — میں سمجھ لیتا ہوں ہر انجام کو آغاز سے

موت اِس محفل میں تیری زندگی کا ہے مآل — میرے جلوے غیر فانی میری ہستی لازوال

دل ترا محروم سوز و امتیازِ زندگی — میرے سوز و ساز میں مضمر ہے رازِ زندگی

تُو چراغِ راہ ہے نا آشنائے بام ہے — میں مُسلماں ہوں مجھے دونوں جہاں سے کام ہے

دینے والے نے دیا دل کو ترے سوزِ نمود — میرے ذمہ کاروبارِ احتسابِ ہست و بُود

میری فطرت کی تجلّی خاص بھی ہے عام بھی — آفتابِ صبح بھی میں ہوں چراغِ شام بھی

کام جب لیتا ہے باطل قوتِ شمشیر سے — زلزلے اُٹھتے ہیں میرے نعرۂ تکبیر سے

سختیٔ راہِ وفا پر نرم ہو جاتا ہوں میں — حق کی آہِ سروشن کر گرم ہو جاتا ہوں میں

میرا شیوہ ہے یہی میرے لئے وجہِ شرف
برمحل سر در گریباں، سر بسجدہ، سر بکف

شفیق فتحپوری

شاعری

شاعری ہر ادب ہے یا برائے زندگی
آج کرنی ہے شفیق اس راز کی پردہ دری

ذہنِ انسانی پہ کرنا ہے حقائق آشکار
دور کرنا ہے افق سے جاہلیت کا غبار

مدتیں گذریں ہمارے شاعرِ مضموں نگار
ہیں اسیرِ کاکل و گیسوئے جاناں کے شکار

صنفِ نازک پر کسی کی شاعری کا انحصار
کوئی شیدائی لبوں کا کوئی عارض کا شکار

جی رہے ہیں آج تک جو وامق و عذرا ہائے ہجر
کر رہے ہیں فخر کچھ پس ماندۂ اجداد پر

آج تک غالب ہے ان پر بیش رفتہ کا اثر
کہنہ پیمانۂ گل و بلبل سے ہے یہ اب تک حذر

ان کو ورثہ میں ملا ہے صرف لفظی داؤ پیچ
ان کے نغموں میں حقائق کی گہرباری ہے ہیچ

شاعری ہے گر اصولِ قافیہ بندی کا نام
تُف ہے ایسے فن کو ایسی شعر گوئی کو سلام

یہ حقیقت ہے مجھے اس میں نہیں ہرگز کلام
شاعری میں ہے جمالیات کا بھی اک مقام

لیکن اے عاقل رفیقو، اہلِ دانش دوستو
کیا ضرورت ہے فقط جام و سبو کی وقت کو

کیا شمیمِ سنبل و سوسن ہے دردِ دل کا علاج
کیا سنور جائے گا اس سے نظمِ عالم کا مزاج

کیا مداوائے جہاں ہے مستِ شیریں داستاں
کیا سکوں پرور ہیں حسن و عشق کی رعنائیاں

کیا پلٹ سکتے ہیں طوفاں غمزہ ہائے ہوشا
خال و خد کی دلکشی ہے کیا تقاضائے جہاں

زندگی کا کونسا گوشہ ہے جو محفوظ ہے
کھا رہا ہے ابنِ آدم آج ٹھوکر پے بہ پے

مفلسوں کی آہ سے معمور ہے ایوانِ عدل
بک رہے ہیں کوڑیوں کے مول پھر انصاف و عقل

پردۂ جمہوریت میں خود پرستی کا نمود
اشتراکی بطن میں سرمایہ داری کا وجود

آمریت کا علم لہرا رہا ہے چار سُو
بڑھ رہا ہے یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو

بڑھ رہی ہیں شورشیں لمحہ بہ لمحہ پل بہ پل
کیا تمھاری نغمگی ہے چاک دامانی کا حل

آؤ کر ڈالیں بنائے نو پہ تعمیرِ ادب
روزِ روشن میں کریں تبدیل یہ تاریک شب

ماہ پاروں کے خمار آگیں فسوں کو توڑ دیں
نازنینانِ سمن بر کی کلائی چھوڑ دیں

توڑ دیں ہاں توڑ دیں یہ حلقۂ جام و سبو
خاک کے ذرات میں پیدا کریں ذوقِ نمو

نوجوانوں کو بتا دیں آج رمزِ شاعری
شاعری وہ ہے جو ہو ہمرشتۂ پیغمبری

شاعری وہ ہے جو دیتی ہو پیامِ زندگی
جس کے آگے ماند ہو خورشید کی رخشندگی

شاعری وہ ہے جو ہو مجموعۂ فکر و عمل
جس سے کھل اٹھتا ہو قلبِ آدمیت کا کنول

شاعری وہ ہے جو فطرت کے دریچے کھول دے
اپنے نغموں سے نئی فکروں کے موتی رول دے

شاعری وہ ہے کہ جس کی خاک میں ہو کیمیا
وسعتوں میں جس کی گم ہو وسعتِ ارض و سما

شاعری وہ ہے جو دیتی ہو سبق کردار کا
فرق واضح کر دے جو عالم پہ نور و نار کا

شاعری وہ ہے جو ہو مستغنئ فردا و دوش
جس کی ہر ہر لے میں پوشیدہ ہو پیغامِ سروش

شاعری وہ ہے عیاں ہو جس سے رازِ کائنات
جس کی ضو سے جگمگا جائے چمن زارِ حیات

شاعری وہ ہے جو بخشے آہنی قلب و جگر
نظمِ عالم میں کرے پیدا نئے شام و سحر

شاعری وہ ہے نہاں ہو جس میں وقتِ انقلاب
تیغ و شمشیر و سناں ہوں جس کے طاؤس و رباب

جس کا پرچم اڑ رہا ہو قصرِ استبداد پر
ضرب جس کی ہو فسادِ عالمِ ایجاد پر

جو نہ ہو حلقہ بگوشِ فرقہ و قوم و وطن
عالمِ انسانیت ہو جس کا موضوعِ سخن

پیکرِ خاکی کو بخشے جو حیاتِ جاوداں
جس کے نغموں سے ابل پڑتا ہے بحرِ بیکراں

جس کی آنکھوں میں ہو [illegible] قضا
جس سے حل ہوں عہدِ مستقبل کے پیچیدہ نکات

جس کے ابرو کے اشاروں پر ہو رقصاں کائنات
جھوم اٹھے نغمات پر جس کے چمن زارِ حیات

جس کے سینے میں ہو روشن زندگی کا آفتاب
جس کے ہاتھوں میں کڑکتی ہو کمانِ انقلاب

گیسوؤں کے پیچ و خم میں زندگی ممکن نہیں
لوریوں کے زیر و بم میں زندگی ممکن نہیں"

برقؔ علوی کاکوروی

نور و ظلمت

کون پوری کر رہا ہے سنتِ فرعون آج　　کس کے دم سے رونے ہستی پہ ہے ظلمت کا حصار
سر کو انسانوں کے اونچا کر رہا ہے کون آج　　کس کے دم سے آدمیت کا بھرم ہے برقرار

ننگِ تہذیب و شرافت کون ہے۔ بولے کوئی
داعیٔ خلق و مروت کون ہے۔ بولے کوئی

کون ہے نخچیرِ باطل، کون ظلمت کا اسیر　　کون "مشرق" کا شکاری، کون "مغرب" کا شکار
کس نے بیچے ہیں سیاست کی دوکانوں پر ضمیر　　کس نے پھیلایا ہے مصری زندگی میں انتشار

بانیٔ ظلم و شقاوت کون ہے۔ بولے کوئی
پیکرِ حق و صداقت کون ہے۔ بولے کوئی

کون ظلم و بربریت پر ہے نازاں آج بھی　　کون دھمکاتا ہے فوجی قوتوں سے بار بار
کون ہے "انسانیت" پر اپنی شاداں آج بھی　　کس پہ رازِ زندگی ہو گیا ہے آشکار

نیل کی وادی یہ کس کے خوں سے لالہ زار ہے
مصر کی غیرت پہ افرنگی کا مہلک وار ہے

ظلم کے ہاتھوں میں کب تک زندگی کی باگ ہے　　تا بہ کے برپا رہے گا فتنۂ زندان و دار
یہ نظامِ بربریت خاک میں ملنے کو ہے　　ٹوٹ جائے گا طلسمِ قید و بند و اختیار

سامری ہاتھوں سے چھن جائے گی جادو کی چھڑی
ختم ہو جائے گا یہ افسونِ زور و اقتدار

(پروفیسر) منظور احسن عباسی

مُرادِ غالب

یعنی

دیوانِ غالب کی شرح

ا

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

شوخی بمعنی بے پروائی کس کنایہ از ذاتِ حق۔ کاغذی پیرہن ہونا بمعنی فنا کی ہونا یعنی ہر شخص کو شکایت ہے کہ نقاشِ ازل نے اسے ایسا کیوں بنایا۔ (قلیلٌ من عبادی الشکور)

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاو کاو بمعنی کاوش و کاوش یعنی شبِ تنہائی کی کلفت میں رات کاٹنا۔ اور دن کرنا ایسا ہی دشوار ہے۔ جیسا کوہکن کو پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر کا لانا دشوار تھا۔ (درازیٔ شبِ ہجراں)

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یعنی اہلِ عشق قتل ہونے کے اس قدر مشتاق ہوتے ہیں کہ جذبۂ شوقِ قتل تلوار کی دھار کو، تلوار سے باہر کھینچ لیتا ہے۔ (شوقِ جاں نثاری)

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

آگہی بمعنی ادراک۔ عنقا بمعنی غیر الحصول۔ یعنی اگر ادراک چاہے کہ بحسن استماع میری تقریر کا مدعا پائے۔ تو یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کا مدعا پانا عنقا کی طرح سخت دشوار ہے۔ (دشواریٔ فہم مطالبِ غالب)

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیرِ پا بمعنی بے قرار یعنی قید میں بھی۔ شدتِ اضطراب کا یہ عالم ہے کہ اس کے سامنے بیڑیاں جلے ہوئے بال کی طرح بودی ثابت ہوتی ہیں۔ (مبالغۂ اضطراب)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

روئے کار نہ آیا۔ یعنی منظرِ عام پر نہ آیا یعنی صحرائے عشق شاید چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا۔ کہ قیس کے سوا کوئی اور مردِ میدان اس میں نہ آیا۔ اشارہ یہ ہے کہ جنونِ عشق ہر شخص کا بہرہ نہیں۔ بقول۔

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(کمیابیِ عشقِ صادق)

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

نقش درست کرنا بمعنی معرضِ وجود میں لانا۔ دود کنایہ از آشفتہ حالی۔ یعنی سویدائے دل دراصل ایک داغ ہے۔ جو دودِ آہِ آشفتگی سے پیدا ہوا۔ (دردمندیِ دلِ عاشق)

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

یعنی سودائے عشق میں سود و زیاں کا خیال جبھی تک ہے کہ انسان خوابِ غفلت میں ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد محبوبِ حقیقی کے تعلق میں سود و زیاں کا خیال ختم ہو جاتا ہے۔ بقول ؎ عشق ناتمام است یا حد بشکلا ہوس و ننگ
تختۂ مشقِ جنون لے گیا زنجیر پا ست
(اخلاصِ عشق)

پڑھتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

یعنی میں مکتبِ عشق کا ہنوز مبتدی ہوں کہ ابتدائی سبق مثلاً رفت معنی گیا اور بود معنی تھا کے سوا نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ صرف اتنا جانتا ہوں کہ دل جو کبھی تھا۔ اب وہ نہ رہا باقی ہیچ۔ (زیاں کاریٔ عشق)

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

یعنی جب تک زندہ رہا ہر جامہ میں ننگا ہی رہا کہ میرے عیب عیاں تھے۔ اس برہنگی کو کفن نے ڈھانپ لیا۔ مطلب یہ کہ صرف موت تھی۔ جس نے میرا پردہ ڈھک لیا (پردہ پوشیٔ مرگ)

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یعنی کوہکن زخمِ تیشہ سے مرا تو کیا مرا۔ اس طرح تو سبھی مرتے ہیں۔ مرد آزاد تو وہ ہے کہ مرنے کیلئے بھی آلاتِ مرگ کا محتاج نہ ہو۔ (مرگِ عاشق)

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

مدعی معنی مالِ مسروقہ یعنی تمہارے اس طرح کہنے سے کہ اگر کوئی دل پڑا ملا تو نہ دیں گے میرے دل کا پتہ چل گیا۔ کہ ضرور تم نے چرایا ہے۔ کیونکہ میرا دل گم ہے۔ اور ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جسے پتہ ہو (اظہارِ عشق)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا

دردِ لادوا بمعنی عشق یعنی میری طبیعت سقیم تھی کہ لطفِ زیست سے خالی تھا۔ اسی وجہ کا علاج دردِ لادوا (عشق) تھا۔ سو مل گیا اور زندگی کا مزہ آ گیا۔ (ذوقِ عاشقی)

دوست دارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

دشمن کنایہ از معشوق یعنی دل معشوق کو دوست رکھتا ہے۔ وہ کب چاہے گا کہ دوست کے خلافِ مرضی ہو۔ جبھی تو اس کے نالہ و فریاد میں اثر نہیں۔ (بے اثریٔ آہ و نالہ)

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

یعنی معشوق بے پروا کو بے خبر اور سادہ لوح مت سمجھو وہ تو غضب کی دکاوٹ اور ہوشیار رکھا ہے کہ اس طرح عاشق کی جرأتِ شوق کو آزمانا چاہتا ہے۔ (عیاریٔ معشوق)

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

یعنی کھلتی کلی کو کیا دیکھا۔ گویا خون شدہ اور گم گشتہ دل مل گیا۔ مطلب یہ کہ بہار کے آغاز نے تمنائے عشق کو پھر تازہ کر دیا۔ (فتنہ انگیزیٔ بہار)

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

یعنی میں کئی بار دل باختہ ہوا اور تم نے ہر بار دلبری کی۔ بس دل کے باب میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں۔ مطلب یہ کہ اہلِ عشق وارداتِ قلب کے سود و زیاں اور کیف و کم سے بیخبر ہوتا ہے۔ (سادگیٔ عشق)

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

یعنی پندِ ناصح سے بجز تلخیٔ الم میں اضافہ ہونے کے دردِ عشق کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ (تلخیٔ پند در بابِ عشق)

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

سوزِ نہاں کنایہ از تپشِ عشق بے محابا یعنی بجوشی خاطر۔ بے دھڑک۔ یعنی میرا دل عشق کی آتشِ پنہاں میں نالہ و فریاد کے بغیر جل گیا۔ گویا اس کا جلنا ایسا تھا جیسے بے شعلہ کی آگ سلگتی رہی اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ (بیانِ غمِ پنہانِ عشق)

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یعنی مایوسی اور افسردہ خاطری کا یہ عالم ہے کہ دل میں جو شوقِ وصال تھا یا یادِ یار باقی تھی وہ بھی ختم ہے۔ گویا اس گھر میں ایسی آگ لگی کہ متاعِ خانہ میں سے جو باقی تھا وہ سب جل گیا۔ (سوختہ سامانیٔ عشق)

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

یعنی اے مقامِ فنا سے غافل انسان! وہ جو ملکِ عدم میں عنقا کا وجود باقی ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ اب میں فنا کے ایسے مقام پر ہوں جو عدم سے بھی آگے ہے ورنہ ملکِ عدم میں تو عنقا کے پر میری آہِ آتشیں سے کئی بار جل چکے تھے۔ اگر میرا مقام عنقا کے ہی ہم رتبہ ہوتا تو اب تک وہ کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ (مبالغہ بے حقیقتی وجود)

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

یعنی میرا تخیل اتنا تابناک ہے کہ وحشت کو خیال میں لاتے ہی صحرا (جسے وحشت کا شہکار مانتے ہیں) جل گیا۔ (مبالغۂ گرمیٔ اندیشہ)

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

یعنی داغہائے دل سوزناک و پُربہار تھے۔ لیکن دل جس میں داغ کی یہ شمعیں روشن تھیں وہ خود سوزِ عشق سے جل گیا۔ اب دل ہی نہ رہا تو داغِ دل کی بہار کہاں؟ (مبالغۂ افسردہ خاطری)

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

یعنی دوستوں کی کھوکھلی گرمجوشی سے دل ایسا جلا ہے کہ اب چاہتا ہوں کہ دوستی کا ولولہ ہی نہ رہے (شکوۂ تصنع و تخن سازیٔ احباب)

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

یعنی اہلِ عشق ہر حال میں بے سر و ساماں ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ قیس تصویر کے پردے میں بھی بے پردہ یا بے لباس ہی نظر آیا (بے سر و سامانیٔ اہلِ عشق)

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

یعنی میں ایسا دل تنگ ہوں کہ زخم بھی دل کی تنگی کو نہ کھول سکا چنانچہ تیر بھی سینے میں کھب کر اس طرح نکلا جیسے بھنچا ہوا پرندہ پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا نکلتا ہے۔ (دل تنگیٔ عاشق)

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

یعنی تیری محفل سے جو آتا ہے وحشتِ جنونِ عشق میں سرپھرا ہوتا ہے (وحشت انگیزیٔ حُسن)

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

یعنی میرا غمگیں دل دردِ عشق کا ایک دسترخوان ہے کہ اُس سے اشیائے درد انگیز ملتے ہیں اور ہر شخص کو بقدرِ صلاحیت لذت آشنائے درد کر دیتا ہے۔ (سوزِ بیاں)

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

یعنی مشکل یہ ہے کہ درسِ فنا بھی جب ہمتِ مشکل پسند کو آسان معلوم ہو تو اب اُس کی مشکل پسندی کی تسکین کس طرح ہو؟ (مقامِ ہمت بلند)

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

یعنی میں نے رونا ضبط کیا تھا لیکن ضبط سے دل طوفان کی طرح امنڈا آ رہا ہے۔ گویا آنسو کے جو قطرے نہ نکلے تھے وہ طوفان بن گئے۔ (اضطرابِ ضبطِ گریہ)

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

بابِ نبرد یعنی مقابلہ کی اہلیت رکھنے والا۔ نبرد پیشہ یعنی جنگجو
یعنی عشق کی چوٹ وہی جھیلتا ہے جو بہادر ہو۔ نااہل تو عشق کی پہلی ہی دھمکی میں مر جاتا ہے۔ (دشواریٔ تحملِ شدائدِ عشق)

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
مرنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

یعنی مرنے سے پہلے بھی خوفِ مرگ سے مجھ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی
مطلب یہ کہ زندگی جس کا انجام موت ہے موت سے کچھ مختلف نہیں (بے حقیقتیٔ حیات و دنیا)

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یعنی ابتدا ہی سے جبکہ ہنوز قوت متخیلہ کی تہذیب نہ ہوئی تھی۔ میں وفا کی کتابیں تصنیف کرنے لگا تھا مطلب یہ کہ ابتدا ہی میں عشق میں کامل تھا۔ (عشق آمادگی فطری)

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یعنی ایک وقت تھا کہ میری طبیعت کی رنگینی و بہار آفرینی کے آگے پھول کی تازگی بے حقیقت تھی لیکن اب دل و جگر کا تمام راستہ دریائے خوں کا ساحل بنا ہوا ہے۔ (جگر افگاری غم عشق)

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

یعنی دل ہے تو غمِ عشق میں مبتلا اور دل گیا تو غمِ دل کا ابتلا غرض غم سے کسی حال میں نجات نہیں۔ (دوام غم)

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یعنی زنداں۔ وحشتِ دل کا علاج نہیں ہے کیونکہ خیال تو اب بھی بیابانوں میں پڑا پھرتا ہے۔ (بے درمانی جنونِ عشق)

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مطلب یہ ہے کہ اسد خستہ جان کی لاش بے کفن کو دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ وہ کیا مرد آزاد تھا کہ مرنے کے بعد بھی قید کفن گوارا نہ کی۔ (آزاد مرد شاعر)

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

یعنی محبوب کو دانۂ تسبیح کا شمار کرنا مرغوب نظر ہے کیونکہ اس کی طبیعت مشکل پسند ہے اور تسبیح پھیرنا گویا ایک ہاتھ میں سینکڑوں کا لے لینا یا ایک وقت سینکڑوں کو اپنا دلدادہ بنا لینا ایک مشکل کھیل ہے جو اسے مرغوب ہے۔ (ذوقِ دلربائی محبوب)

بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

یعنی کشادکار کو یہ بات پسند آئی کہ ہماری مشکل ناقابلِ حل ہے۔ کیونکہ اس سے دل ٹوٹ جائے گا اور ہمیشہ کے لئے مایوسی ہو جائے گی تو پھر مشکل نہیں رہے گی اور آسانی ہو جائے گی۔ بقول ؎

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے (سکونِ یاس)

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

یعنی پھولوں کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی بسمل خون میں تڑپتا ہوا ہو معشوق قاتل کی بے مہری اس سے ظاہر ہے کہ وہ سیر گل کا شائق ہے۔ گویا ایسے نظارہ کو پسند کرتا ہے۔ (بے مہریٔ معشوق)

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

غمخوارِ جانِ دردمند طنزاً مراد از عشق یعنی مبارک ہو ہمارا غمخوار عشق آگیا ہے۔ اور زخم ہیرے کی کنی اور داغِ جگر سامانِ غم و ہلاکت ساتھ لایا ہے۔ (بیانِ عواقبِ عشق)

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

یعنی دنیا میں وفا ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہی کچھ نہ نکلے اور کوئی مطمئن نہ ہوا۔ (شکوۂ بے وفائی اہلِ دہر)

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

یعنی زمرد کے سامنے افعی کا زہر کام نہیں کرتا لیکن تیرا سبزۂ خط کیسا زمرد ہے کہ افعی کاکل کو بے قابو نہ کر سکا۔ مطلب یہ کہ سبزۂ رخسار کے باوجود کاکل کی جاں ستانی میں فرق نہیں آیا۔ (بے پیریٔ حسنِ محبوب)

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

چاہتا تھا کہ مر کر وفا کے غم سے نجات پاؤں لیکن معشوق ایسا ظالم ہے کہ وہ اس پر بھی راضی نہیں اور وہ یہی چاہتا ہے کہ خواہ کتنی ہی تلخ کامیاں ہوں وفا پر قائم رہو۔ (ستم کوشی معشوق)

(باقی آئندہ)

ادیب اور کردار

سید مستفیض الحسن، ایم۔اے۔

ادب کی دنیا ایک رنگین سا طلسم ہے۔ یہاں عجیب عجیب باتیں لکھی اور کہی جاتی ہیں۔ ان باتوں کے کہنے اور لکھنے کے انداز بھی نوع نوع کے ہوتے ہیں اور ان کے محرک اور مقاصد بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں۔

کچھ باتیں اس لئے لکھی یا کہی جاتی ہیں کہ ان کے لکھنے یا کہنے والے کو لکھنے یا سنانے کی خارش ہوتی ہے اس لئے جب تک وہ لکھ نہیں لیتے خارش باقی رہتی ہے JUNEVAL نے صحیح کہا ہے۔

THE INCURABLE ITCH OF WRITING POSSESSES MANY

ایسے لوگ صرف لکھنے کے لئے لکھتے ہیں اور ان کی خلقتِ ادب کا اگر کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اپنے احساسات، جذبات، اور ذہنی ترغیبات کو مجتمع کر کے اپنی قوتِ تخلیق (CREATIVE URGE) کی تسکین کر لیں۔

یہ ادیب اپنی ادبی تخلیقات کے خاکے تو اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ہی مستعار لیتے ہیں مگر اس آرٹسٹ کی طرح جو اعضا کی ہم آہنگی کی کھوج میں ایسے فن پارہ کی تخلیق کرے جس کی ٹانگیں اور دھڑ بکری کا ہو اور سر انسان کا۔ یا عورت کا ہو اور باقی جسم مچھلی کا اور اس طرح اپنے مشاہدات کو اپنی ذہنی ترغیبات سے خلط ملط کر کے اپنی ادبی تخلیق کو عجیب الخلقت بنا دیتے ہیں۔

یہ ادیب نقشۂ کائنات کو بچوں کا ایک کھیل سمجھتے ہیں اور زندگی کی تشکیل کے ہزارہا امکانات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے تمام مشاہدات اور تجربات کو اپنی ذہنیت کے تحت قلمبند کرتے ہیں اور کبھی تصورات کی جنت تعمیر کرتے ہیں۔ اور کبھی اپنے ماحول میں تلذذ کی گنجائش نہ پا کر ذہنی تلذذ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ خواب و خیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور حقیقتوں کی دنیا سے اسی حد تک تعلق رکھتے ہیں جہاں تک زندگی ان کے ذوقِ تصوریت Idealism کے منافی نہ ہو۔ اگر زندگی کے حقائق ان کی تصوریت کے آڑے آتے ہیں تو وہ ان حقیقتوں سے اعراض کرتے ہیں اور فراریت اختیار کرتے ہیں۔

اس طرح کی ذہنیت رکھنے والے ادیب اپنی تخلیقات کو طلسماتی روپ دیتے ہیں۔ جو اخلاقی حیثیت سے بہت مضر ہوتا ہے۔ ادب کے اعلیٰ مقاصد سے بھی ان کو کوئی لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ اگر کوئی لگاؤ رہتا بھی ہے تو وہ غیر فطری ہے اور صرف اس فردِ واحد کی تسکین کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ جس نے اس کو تخلیق کیا ہے۔ مگر زندگی کی تعمیر و تشکیل اس شکل سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ ادیب، کائنات کی موجودہ ہیئت سے ناواقف ہے اور ایک تخیلی ہیئت دیتا ہے جو کائنات کے اصولِ تعاون کی متضاد ہوتی ہے۔

ایسے ادیب ذہنی طور پر اپنے ماحول سے کٹے ہوئے ہیں چونکہ ان کی زندگیاں اس ماحول ہی کی پیداوار ہوتی ہیں اور اس لئے ان کی تمام زندگی ایک ذہنی تنازعہ (MENTAL CONFLICT) بن کے رہ جاتی ہے۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو وہ خود نہیں کرتے اور وہ نہیں کر سکتے۔ قول و فعل کی یہ دوئی ان کے قارئین کو بھی سوائے الجھن کے زندگی کی کوئی صالح تفہیم نہیں دے سکتی۔ اور یہ ادیب اور ان کے قاری لاشعوری طور پر زندگی پر عمل تخریب شروع کر دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو زندگی سے بالاتر رکھ کر کوئی ایسا فلسفہ وضع نہیں کیا جا سکتا جو قابلِ عمل ہو۔ تصورات کی جنتوں کو جامد شکل میں تعمیر کرنا محال ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ذہنیتیں جو تصوریت کے قریب ہیں اگر زندگی کی از سرِ نو تشکیل کی متمنی ہوتی ہیں یا مستقل فریبِ نفس میں مبتلا رہتی ہیں اور اپنی نفسیاتی کیفیات کو اپنے کردار میں منتقل نہ کر سکنے کی بنا پر معاشرہ کے احساس ذہن پر وہ اثر کرتے ہیں جو آکاش بیل (PARASITES) اونچے درختوں پر کرتی ہے جو اسے مجبوراً حیات دیتے ہیں۔

کچھ ادیب نام و نمود کی خواہش سے لکھتے ہیں۔ یہ لوگ عوامی ادب کے نام سے دنیا کے پست ذوق کی تسکین کے لئے ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور

اپنی ستی نمود کے لئے بیچ دیتے ہیں۔ وہ ادب کو ایک شے سمجھتے ہیں اور معاشیاتی اصول طلب و فراہمی کے مطابق اس کی تجارت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک تمام دنیا ایک تجارتی منڈی ہے اور ان کے نظریے کے مطابق ادب کی تخلیق کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اس کے ذریعہ عوام کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

عوام عموماً بہت سطح پسند ہوتے ہیں۔ ان کی نظر حقائق تک پہنچنے سے پہلے رنگ کے خس و خاشاک میں الجھ جاتی ہے۔ ان کے تصورات کامل طور پر خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ مادہ پرست ہوتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح زندگی رنگین ہو جائے۔ اس میں کچھ لذتیت کے پہلو نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے عوام کے لئے جو ادب تخلیق ہوگا۔ وہ صرف ظاہر کی عکاسی کرے گا۔ اور یہ ظاہر عموماً ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کی پشت پناہی کے لئے کردار اور حسن عمل کی پشتیبانی کی چنداں ضرورت نہیں۔ سطح پسند عوام کو ان خارجی موجودات کے داخلی وجود کے بارے میں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔

ایسے ادیب جو عوام کے لئے لکھتے ہیں، روحانی یا اخلاقی حدود سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ ایک بھانڈ کی طرح وہ عوام کے پست ذوق کے مطابق ناچتے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو انہیں کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ اس کا مقصد نہ زندگی کی تعمیر ہوتا ہے نہ تطہیر۔ یہ ادب محض خارجی محسوسات و مشاہدات کی ترجمانی کرتا ہے۔ معاشرہ کی تمام خرابیوں میں لذتیت کے پہلو اجاگر کر کے پیش کرنا اس مکتب ادب کا کمال ہے۔ یہ حضرات معاشرہ کی برائیوں کو بڑھا بڑھا کر پیش کرتے ہیں اور ان گھناؤنے پہلوؤں کی عکاسی میں لذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ نتیجتاً یہ لذت پسندی بیماری کے جراثیم کی طرح سماج کے جسم میں پھیل کر اسے اخلاقی طور پر بے حس بنا دیتی ہے۔ لذتیت فروغ پاتی ہے اخلاقی دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں اور سارا سماج گھناؤنا ہو جاتا ہے۔

گندے دھاروں کے رخ پر بہنے والے ادیب زندگی کے سرچشموں کو صاف نہیں کر سکتے۔ ان کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ وہ بے اصولے ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان سے زندگی کو صالح اقدار نہیں مل سکتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی خارجی وجود نہیں رکھتی۔ اس کے کچھ باطنی محرک بھی ہوتے ہیں۔ اور ان باطنی محرکات سے علیحدہ ہو کر زندگی نہیں رہتی۔ زندگی کے ان باطنی محرکات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کردار کی ضرورت ہے۔ مگر ان نام نہاد حقیقت پسند ادیبوں نے رمزیت۔ اشتریت اور اظہاریت۔ حسین پردوں کا سہارا لیا اور حقیقت پسندی کے نام پر رمزیت نے لذتیت کو ابھارا۔ اشتریت نے ذہنوں کو جرم پسند بنایا اور اظہاریت نے جنس پرستی کو ہوا دی۔ اس طرح اخلاقی اور روحانی قدروں کا جنازہ نکل گیا۔ اسی حقیقت پسندی نے طبقاتی کشمکش کے شعلوں کو بھڑکایا اور انسانوں کو انسانوں کے خلاف مشتعل کر کے ساری فضاؤں کو مسموم کر دیا۔ اور قلبی منصوبہ تخلیق میں جو توافق پایا جاتا تھا اس کو نظر انداز کر کے جہد للبقاء کے نظریہ کی ترویج کی۔ نتیجہ ظاہر تھا جوں جوں علم و فن بڑھتے گئے۔ انسانیت کا دم گھٹتا گیا ؎

"کہاں سے بڑھ کے پہونچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی، نہ من ساقی"

نظریات اور زندگی کی حقیقتوں میں کوئی تعلق نہ رہا اور ادب زندگی سے بے نیاز ہو کر صرف ادب برائے ادب بن گیا۔ کیونکہ ان ادیبوں کی بوالہوسانہ روش کے لئے اظہار کا موقع اسی طرح ممکن تھا۔ یہ ادیب بھیڑ کی کھالوں میں ملبوس بھیڑیے تھے جنہوں نے معصوم بھیڑوں کے گلوں میں گھس کر ان کو خاک و خون میں لٹایا۔ اور زندگی کو ایک لاشۂ بے گور و کفن بنا دیا۔

ادیبوں کا تیسرا گروہ تعمیر پسند ادیبوں کا گروہ ہے۔ جو ادب برائے تعمیر و تطہیر کا قائل و داعی ہے۔ یہ گروہ زندگی کا من حیث کل مطالعہ کر کے توافق کے پہلوؤں کو ڈھونڈتا ہے۔ خارجی اور باطنی معاملات کو ان کا جائز مقام دیتا ہے تاکہ انسان کے احساس، تاثر اور طرز فکر میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ اور توافق للبقاء کا الٰہی منصوبہ تخلیق، فہم کے حدود میں آ جائے۔ یہ ادیب اپنے احساس کی تربیت کرتے ہیں اور ماحول کی کشمکش سے مرعوب ہونے کے بجائے اسے متاثر کرنے کی سعی کرتے ہیں ؎

ستم یہ ہے کہ اندھیروں کے درمیاں رہ کر
نمود صبح کے جلوؤں کی بات کہتا ہوں

وہ اخلاق کی معروف قدروں کو اجاگر کر کے انسانوں کو زندگی کی صالح تعمیر اور اس کے امکانات کے تدبر پر آمادہ کرتے ہیں تاکہ وہ یہ محسوس کریں کہ جب بھی انسان نے خدائے واحد کی عبودیت کے فطری تقاضے سے منحرف ہو کر نفس امارہ کی عبادت شروع کی، وہ ذہنی انتشار میں گھر گیا اور انسانیت سکون ناآشنا ہو گئی۔ بقول کسے ؎

تم نے سوچا بھی ہے انسان پریشاں کیوں ہے
قافلہ منزل و مقصد سے گریزاں کیوں ہے
ہم نے فطرت کے تقاضوں کو دبا رکھا ہے
نفس امارہ کو معبود بنا رکھا ہے

خلق گردش میں ہے لیکن کوئی محور ہی نہیں
مقصدِ زیست حقیقت کا مظہر ہی نہیں
آؤ اسرار الٰہی کو نمایاں کر دیں
خاک کے ذرّوں کو خورشید درخشاں کر دیں

ادب کی اس تعمیری تحریک میں اوّل الذکر ادبی تحریکات کی طرح ادیب کی شخصیت اگر تصوریت، گریز یا فرار کی جھلکیوں میں پوشیدہ ہو تو ادیب کا مقصد فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ شر بڑی حد تک متعدی ہوتا ہے اور بغیر کسی خاص سعی کے بھی اپنی ابلیسانہ کشش کے سہارے پرورش پاتا رہتا ہے۔ خیر اور صلاح کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس منزل میں نفس کی سرکشی کو کچلنا پڑتا ہے اور دوسروں کو اس تقویٰ کی طرف بلانے کے لئے جب تک ان فوائد کا عملی مظاہرہ نہ ہو۔ جو اس طرز حیات سے حاصل ہوں گے صرف دعوت و تبلیغ ناکافی ہوں گے۔ جب تک ادیب کا کردار طمانیت و سکون کا مرقع۔ بن جائے۔ جب تک وہ اخلاقی معیار جس کے برپا کرنے کا وہ داعی ہے اس کی زندگی میں پاکیزگی اور تسکین کے عناصر سمو دیا۔ محض تبلیغ سے یہ امید عبث ہے کہ دنیا متوجہ ہوگی اور اس طرز فکر کو اپنائے گی۔

تعمیر پسند ادیبوں کے اس گروہ کو ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی سعی بھی کرنی پڑے گی۔ جس کا نظریاتی عکس وہ اپنی ادبی تخلیقات میں پیش کر رہے ہیں۔ معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے لہٰذا تعمیر پسندی کے لوازم میں سے ایک اہم لازمہ یہ ہوگا کہ ادیب اپنے کردار کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال کر دنیا کے سامنے مثال بن کر آئے۔

اس سے قطع نظر یہ امر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ تعمیر پسند ادیب زندگی کی سطح پسندانہ روش سے ہٹ کر اُسے حقائق کی اساس پر استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اُن کو بے پناہ خلوص کی ضرورت ہوگی۔ نام و نمود کے جھوٹے بتوں کو شکست کرنا ہوگا۔ ورنہ ان کی کاوشیں بے سود ہوں گی کیونکہ ایسے حالات میں ارتقائے حیات کی کیا اُمید جبکہ ؎

بانگ جرس ہے قافلے والوں کی ہر صدا
اور دور دور ذوقِ سفر کا پتہ نہیں

اگر یہ ادیب اپنے کردار کی تعمیر اور ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل میں کامیاب نہ ہوئے تو ان کی ادبی تخلیقات بھی تصوریت کے ذیل میں شمار ہوں گی۔ اور ان کا مقصد فنا ہو جائے گا۔

لہٰذا جاہلیت کے ادب کی طرح تعمیر پسند ادیبوں کے قول و فعل میں تضاد نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ توافق اور ہم آہنگی ہونی چاہئے۔ وہ وجوہات کہیں وہ شعری و فنی ضرورتوں کی بھینٹ نہ چڑھ جائے یا اُس پر نام نہاد لطافت کے واضح دبیز پردے نہ پڑ جائیں کہ وہ اپنا واقعی رنگ روپ کھو بیٹھے۔ وہ جو کچھ کہیں اس کو نہ صرف ایمان کی حد تک تسلیم کرتے ہوں بلکہ ضروری ہے کہ وہ اُس کو زندگی کا مطمحِ نظر سمجھے ہوئے ہوں اور اُس پر عامل بھی ہوں۔ اُن کے اشعار زندگی کی ہم آہنگی کے ترجمان ہوں جو کائنات کے رگ و ریشہ میں رواں دواں ہے۔ اُن کی تخلیقات میں وہ ماحول نمایاں ہو جس کی تشکیل کے وہ خواب دیکھ رہے ہیں اور جس کی ایک چھوٹی سی تمثیل انہوں نے اپنی زندگی میں تعمیر کی ہے۔ اُن کے مضامین فطرت و توافق کی تشریح کریں اور اس توافق کا مظہر خود ان کا کردار ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۳

اشعار کہلانے کے مستحق ہیں۔ تفصیل کا تو موقع نہیں ورنہ اشعار بھی پیش کر دیئے جاتے۔ حالی کی غزل اپنا منفرد رنگ رکھتی ہے۔ اس میں میرؔ استاد سے استفادہ کرکے اپنی طبیعت اور جدت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہی حالی کا تغزل ہے۔

بہرحال مختصراً عرض یہ ہے کہ حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے یاد رکھنا اردو ادب کیلئے فالِ نیک ہوگا۔ اور حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے فراموش کر دینا علمی بے بصری ہوگی۔ حالی اردو کا قابلِ قدر غزل گو تھا۔ اس کی شاعری زندہ ہے۔ اور شاید جب تک دنیا قائم ہے وہ زندہ رہے گی۔ خواہ زمانے میں کتنا ہی تغیر و تبدل کیوں نہ ہو جائے۔

بشیر احمد جالبی

غزل اور حالی

عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے کہ حالی ایک اچھے غزل گو بھی تھے۔ وہ زیادہ تر اپنی مسدس کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ حالی کی غزلیں سنجیدہ ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ نہ ان میں وہ سطحی اور سستی مستی ہے جو اس دور کے شعراء کے یہاں بکثرت ملتی ہے اور نہ ان کے اشعار میں مبالغہ و ابتذال ہے۔ حالی کے یہاں ہم کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو واقعیت کے خلاف ہو۔ ان کی زبان میر کی طرح صاف اور شستہ ہے۔ اور میر ہی کا سا انداز بیان ہے۔ حالی بھی میر ہی کی طرح فرسودہ مضامین میں ایک نئی جان ڈال کر پیش کرتے ہیں۔ وہ سیدھی اور صاف بات کہتے ہیں اور انہیں باتوں میں ایک نیا پہلو جو دلوں کو موہ لیتا ہے نکال لیتے ہیں۔ آل احمد سرور نے حالی کے بابت یوں لکھا ہے

"حالی کے اسلوب میں خون جگر کی جھلک ملتی ہے۔ یہ ساحری نہیں کرتا وجد میں نہیں لاتا۔ اپنے خیال کو ادا کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اچھی اچھی تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال سے اپنی دکان نہیں سجاتا۔ یہ محض دریچے کی آرائش کا قائل نہیں ہے۔ اپنے خلوص اپنی سچائی اپنی سادگی سے ایک ایسا اثر چھوڑتا ہے۔ جو عام طور پر تحریر میں نہیں ہوتا" (تنقید کیا ہے۔ ص ۳۵)

حالی صرف نظم جدید کے بانی ہونے کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ نظم جدید میں انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہو اس کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن حالی کا تغزل نظر انداز کی جانے والی چیز نہیں۔ حالی کا تغزل پتہ دیتا ہے کہ اگر انسان کا ضمیر زندہ ہو تو وہ عوام کے دکھ درد سے آشنا ہوتا ہے۔ اوطان کے دکھ درد کو اپنا سمجھتا ہے۔ حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے یاد رکھنا حالی کے لئے نہیں بلکہ اردو ادب کے لئے نیک فال ہوگا۔

ہم اپنی آسانی کے لئے حالی کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اول وہ غزلیں ہیں جو عہد شباب کی یادگار ہیں۔ جب ان کا اپنا کوئی مستقل رنگ نہ تھا۔ اس زمانے کی تمام غزلیں چوٹی، انگیا، سرمہ، مسی، دھینگا مشتی پر مشتمل ہوتی تھیں۔ حالی کی بھی غزلیں اس زمانے کا اثر لئے ہوئے ہیں۔ مگر حالی کی ان غزلوں میں بھی مبالغہ، ابتذال، عریانی و سوقیت وغیرہ نہیں ملتی۔ گو کہ یہ غزلیں پرانے طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں غالباً ہجر و وصال کا تذکرہ آیا ہے مگر یہ ہجر ایک شریف عاشق کا ہجر ہے۔ اور محبوب بھی ایک شریف پردہ نشین ہے۔ عاشق عشق کو بر سر بازار رسوا نہیں کرتا۔ اور نہ محبوب ہی ہر جائی ہے۔ نہ وہ بر سر بام جلوہ افروز ہوتا ہے۔ حالی کی یہ غزلیں بھی صفائی و شستگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ دوم وہ غزلیں جو ناصحانہ اور حکیمانہ طرز پر لکھی گئی ہیں۔ یہ غزلیں اس زمانہ کی یادگار ہیں جب قدیم شاعری کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور جدید شاعری آفتاب نو کی طرح ابھر رہی تھی۔ اب جھوٹی باتیں کرنے اور سننے میں لوگوں کا دل نہ لگتا تھا۔ عشاق آذرگاہی بجھتے بجھتے خاموش ہو گئے تھے اور صبح درخشاں کی جلوہ سامانیوں میں محو ہو گئے تھے۔ احساس رکھنے والے حضرات دل پر ہاتھ رکھے عمر گزشتہ پر تاسف کر رہے تھے۔ غرضکہ ہر طرف جدید رجحانات پھیل رہے تھے۔ ایک تہذیب روشن ہو چکی تھی اور دوسری دم توڑ رہی تھی۔ حالی نے اس زمانے میں جتنی بھی غزلیں کہیں وہ قومی درد لئے ہوئے ہیں جن کے اندر نصیحت ہے تجربات ہے اور پیغام بیداری بھی وہ میدان ہے جس میں حالی اپنے تمام معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ تیسری قسم کی وہ غزلیں ہیں جب آفتاب جوانی نے پیری میں غروب کیا تھا اور صبح پیری ایک نئے انداز میں دل پر حکمرانی کر رہی تھی۔ اب وہ جوش و ولولہ رخصت ہو چکا تھا۔ سوچ اور بچار کی قوت بڑھ گئی تھی۔ اب پیری کی وجہ سے ان کے کلام میں اور پختگی کا راج تھا۔ وہ ہر بات پر سوچی اور بچی ہوئی رائے دیتے تھے۔ لیکن یہ غزلیں دور اول کی غزلوں سے ذرہ کی بھی مشابہت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ حالی نے خود ہی کہا ہے۔ ~

راگنی بے وقت کی [illegible]

حالی نے ہماری شاعری میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ حالی سے پیشتر ہماری شاعری کا زیادہ حصہ عشقیہ [illegible]

ہجر و وصال کے جھگڑے۔ گلۂ چرخ کج رو۔ گل و بلبل کی حکایت۔ ناز و ادا کے تذکرے۔ چھرہ۔ مقتل۔ گور و کفن۔ لاش۔ کنگھی چوٹی کی داستانیں۔ عاشق کی وفائیں۔ ہجر و فراق کا اضطراب۔ شیخ و واعظ کی مذمت اور پھبتیاں۔ بس یہی تھا۔ حالی نے غزل کو ان تمام پستیوں سے نکال کر اس کو عرش کا مکین بنایا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو حیات و کائنات کے مطالعے کے لئے وقف کر دیا۔ اور جو کچھ بھی مشاہدے اور تجربے میں ہاتھ آیا اس کو بے کم و کاست نظم کر دیا۔

مولانا حالی اپنی مشہور تصنیف مقدمۂ شعر و شاعری میں رقم طراز ہیں

تخیل سب سے مقدم اور ضروری چیز ہے۔ جو شاعر کو غیر شاعر سے ممیز کرتی ہے۔ قوتِ متخیلہ یا تخیل جس کو انگریزی میں IMAGINATION کہتے ہیں۔ یہ قوت شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ اور جس قدر ادنیٰ درجے کی ہوگی۔ اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لیکر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے۔ اور باقی شرطوں میں جو شاعری کیلئے ضروری ہیں۔ کچھ کمی ہے۔ تو وہ اس کمی کا تدارک اس ملکہ سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکۂ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اسکے قبضے میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی و مستقبل کو زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے۔ گویا اس نے تمام واقعات اپنی ہی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہئے۔ اسی میں وہ طاقت ہے کہ وہ جن اور پری۔ عنقا اور آب حیوان۔ جیسی معدوم چیزوں کو ایسے معتوں اور صفات کے ساتھ متصف کرتا ہے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جو نتیجے وہ نکالتا ہے۔ گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن جب دل اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ حالی کی شاعری کا بھی ہم اس روشنی میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ دیکھئے ان اشعار میں صرف قوتِ متخیلہ کی وجہ سے کتنی جان آگئی ہے اور شعر کس پایہ کا ہو گیا ہے۔ حالی کی قوتِ متخیلہ ان ویران صحراؤں سے معانی ڈھونڈھ نکالتی ہے جہاں پہ عقل جا کر سرگرداں حیران و پریشاں پھرنے لگتی ہے کہ یہاں سے کیا ملے گا۔ ہم کس اجاڑ بن میں آگئے ہیں۔ مگر حالی کی قوتِ متخیلہ اس اجاڑ بن میں غنچۂ شاداب ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں۔

عشق سنتے ہیں جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

چھپ چھپاتے آتے دے آپے دل اک بات پہ ہم
مال ہوتا نظر آتا تو چھپایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

ملتے ہی ان سے بھول گئے کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی دل میں تو چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ ہجر و وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

مقدمۂ شعر و شاعری میں کائنات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اگرچہ قوتِ متخیلہ اس حالت میں جبکہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اپنی معمولی ذخیرے سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں خاص کر نسخۂ فطرت کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو عمیق نگاہوں سے دیکھنا۔ جو امور مشاہدہ میں آویں ان کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی۔ کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے۔ اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے۔ ان الفاظ کی روشنی میں حالی کی شاعری کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ حالی کے اشعار دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کی نگاہ کتنی دور رس ہے۔ ان کا مطالعۂ فطرت کتنا زبردست ہے۔ وہ سمجھ کے دیئے ہوئے خزانے سے اپنا دامن بھرتے ہیں۔ اور اس کو اپنے قلب میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اس مطالعۂ فطرت کی وجہ سے اشعار میں جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ صرف تخیل سے نہیں پیدا ہوتی۔ تخیل کے ساتھ ساتھ مشاہدۂ قدرت

بھی ضروری ہے بغیر مطالعۂ فطرت کے قطعاً صحیح کام نہیں کر سکتا۔ اس کو ہر گام پر ٹھوکر لگے گی اور وہ بیٹھ جانے پر مجبور ہوگا۔ مگر جب مطالعۂ فطرت اس کا رہبر بنے گا تو وہ با آسانی منزلِ مقصود کو پا جائے گا۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں ؎

تلق اور دل میں سوا ہو گیا — دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
وہ امید کیا جس کی ہو انتہا — وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت — وہ رو رو کے ملنا جدا ہو گیا
ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا — مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں
یونہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرقتِ غم کو بھی ثبات نہیں

شعر جذبات سے معمور ہونا چاہیے۔ اور ایسی انوکھی بات کہنی چاہیے جو دلوں میں نشتر کی طرح اتر جائے۔ زبان ایسی فصیح اور سادہ ہونی چاہیے کہ ہر شخص سمجھ لے اور لطف اندوز ہو سکے۔ جب انسان کا دل جذبۂ الفت سے معمور نہ ہوگا۔ وہ الفت کو ہرگز محسوس نہیں کر سکتا۔ صرف تخیل کے زور پر عشقیہ اشعار لکھنا ایک ناکام کوشش ہوگی۔ اور وہ شعر سوز و گداز۔ درد و اثر سے محروم ہوگا۔ حالی کے اکثر اشعار ایسے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے سامنے سے روزانہ گزرتے ہیں۔ مگر وہ ان میں کچھ ایسا رنگ بھر کر پیش کرتے ہیں کہ واہ کرتے ہی بنتی ہے۔ حالی نے اکثر جگہ میر کا تتبع کیا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ یہ غزلیں اس دور کی یادگار ہیں جب اردو شاعری پر عریانی اور ابتذال کا بھوت سوار تھا۔ حالی نے اپنے ماحول سے بغاوت کی۔ یہ ان کے جذبۂ اجتہاد کی روشن مثال ہے۔ ایک ماہر مشاطہ کی طرح سے اردو شاعری کی زلفِ برہم کو انھوں نے اس انداز سے سنوارا کہ سب ہی دیکھتے رہ گئے۔ حالی کے معاصرین یوں نغمہ سرا ہیں ؎

آپ دکھلاتے ہو، جو ہیں بھی دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے (اکبر؟)

لیکن یہ صرف حالی ہی کی کرامت ہے کہ آج اردو شاعری میں ہم کو اس طرح کے موتی سنائی دیتے ہیں ؎

پھر اب منتظر ہے ہنگامۂ برق
پھر اب قصدِ بنائے آشیاں ہے (فانی؟)

جگر میں چھپاتا ہوں متاعِ سینہ چاکی کو
وہ یوسف کیا جو رسوائے سر بازار ہو جائے (آصف)

انھیں بھی کاش احساسِ محبت کی خبر ہوتی
جھلکتی ہے مرے ان آنسوؤں میں آبرو کس کی (یحییٰ اعظمی)

اب حالی کی چند غزلیں دیکھیے۔ اور مندرجہ بالا سطور پر خود فیصلہ فرمائیے۔ حالی کا یہ رنگ ہی تو دنیا تک نہیں مٹایا جا سکتا اور نہ ہی فراموش کیا جا سکتا ہے۔ یہ غزلیں اردو ادب کے لیے گراں بہا سرمایہ ہیں۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو — وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
تلق گر یہی ہے تو سازِ نہانی — کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے
وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک — دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے
بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی — کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

ابتدائے وفا ہے سر دینا — میری دیکھی نہ انتہا تو نے
ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ — کیا کیا چشمِ آشنا تو نے

وفا اغیار کی اغیار سے سن — مری الفت در و دیوار سے پوچھ
نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق — ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ
قید خانے میں گیا دل جن کا لگ — ان اسیروں کی رہائی نہ پوچھ

مضمون کی طوالت کا ڈر ہے ورنہ طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ ان پھولوں سے اپنا دامن بھرتے چلیے۔ حالی کی غزلوں میں زیادہ تر اشعار قابلِ انتخاب نکل آتے ہیں۔ یہ خوبی صرف چند مسلّمہ کے مقدر میں ہے۔ ان اشعار کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہوگی۔ اس کے بعد میں صالحہ عابد حسین کی تصنیف یادگارِ حالی سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں مولانا کی شاعری کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "دلی کی ہموار زندگی، زمانے کا اثر اور پھر جوشِ دل و دماغ۔ حالی جن کی فطرت انفرادیت اور اصلیت سے کوسوں دور تھی۔ اس ماحول میں انفرادی شاعری کے چکر میں پڑ گئے۔ جو عشق و عاشقی اور اظہارِ خودی کی حد تک محدود تھی۔ حالی نے بھی دیے اور پھول کی طرح اپنا میدانِ سخن غزل ہی کو قرار دیا۔ اور اس میں اپنے جوہر دکھانے لگے۔ لیکن

فری صلاحیت میر اور سعدی جیسے شاعروں کے، مومن، فیض اور غالب و شیفتہ جیسے صاحب ذوق شعراء کی صحبت اور تربیت کی بدولت حالی اس میدان میں بڑی حد تک سنبھلتے رہے۔ چنانچہ ان کے اس دور کے کلام میں بھی نہ تو وہ عامیانہ اور گھٹیا مذاق نظر آتا ہے۔ جس کی بنیاد سطحی عشق، اور ہوا و ہوس کے جذبات پر رکھی جاتی ہے۔ اور نہ معاملہ بندی کا اور کنگھی چوٹی کا وہ ذکر ہے۔ جو اس وقت کے بیشتر شاعروں کا موضوع تھا۔ وہ تخیل کی ان غیر قدرتی رفعتوں پر بھی نہیں اڑتے۔ جن سے شعر ایک گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔ نہ دور از کار تشبیہوں، مبہم استعاروں کا جال بنتے ہیں جن میں الجھ کر شعر کا مطلب خبط ہو جائے۔ انہوں نے اپنے دور حالی شاعروں اور استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ حاصل کیا تھا۔ میر سے درد دل لیا۔ درد سے تصوف کی چاشنی۔ غالب سے حسن تخیل۔ ندرت فکر اور شوخی گفتار سیکھی۔ اور سعدی سے بیان کی سادگی اور معنی کی گہرائی۔ شیفتہ سے سیدھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانے کا فن۔ ان سب ترکیبوں سے حالی کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا۔" (یادگار حالی صفحہ ۱۳۱ اور ۱۳۲)

ان اساتذہ کے استفادوں نے حالی کو ایک منفرد رنگ کا مالک بنایا۔ حالی کے ساز میں سعدی، غالب، میر، درد، شیفتہ کے نغمے ملتے ہیں۔ یہ ساز طرح طرح کے نغموں سے معمور ہے۔ حالی کے زمزمے سب ہی استادوں کے نغمے سے ملتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کو تمام ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسری خاص بات ہے کہ حالی نے اس ساز سے کبھی اپنی جان کو ہوا و ہوس سے کبھی آلودہ نہیں کیا۔ ان کی نبھا تا دم حیات آپ کو تر دامنی سے بچائے رہی۔ ان کے اس پاک تغزل میں ان کی ذاتی خوبیاں بھی پنہاں ہیں۔ ان کا کیرکٹر ایک عظیم انسان کا سا تھا۔ ایک وجہ سے ان کے ہاں بے جا رندی، دستی اور بوالہوسی نہ آنے پائی جو اس دور کے شعراء کا طرۂ امتیاز رہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے حالی کا ایک واقعہ اپنے دوست کی زبانی نقل کیا ہے۔ "دہلی میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ردیف کہاں اور قافیہ نظر، جگر وغیرہ تھا۔ اس مشاعرہ میں داغ اور حالی دونوں شریک تھے۔ مشاعرہ میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داغ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور انہوں نے اپنی غزل ہے جستجو کہ ...... سائل الرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے کہ غزل پورے مشاعرہ پر چھا گئی۔ واہ واہ اور تحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا کہ اب داغ مرحوم کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ خود داغ نے، اس غزل کو سننے کے بعد کہا کہ میری غزل خود میری نگاہوں سے گر گئی۔ جی چاہتا ہے کہ پرچہ چاک کر دوں۔"

حالی کو صرف نظم جدید کے بانی کی حیثیت سے جاننے والے لوگ آئیں اور دیکھیں کہ حالی نے غزل کو کس طرح سنوارا ہے۔ استاد ریختہ، ٹکسالی زبان بولنے والا، محاوروں سے دل موہ لینے والا داغ بھی بھلا حالی کی غزل سننے کے بعد کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب میری غزل خود میری نگاہوں سے گر گئی۔ حالی نے جس راہ میں قدم رکھا اساتذہ ہی کی سی شان سے داخل ہوئے۔ یہ ہم لوگوں کی نظر کی خامی ہے کہ ہم حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے فراموش کر دیں۔

حالی کے بہ حیثیت غزل گو مشہور نہ ہونے میں خود حالی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں۔ "یہ ظلم کہئے یا انتہائی چالاکی دیکھئے یا بیچارگی۔ حالی نے مسدس اور دوسرے قسم کے پند نامے لکھ کر عوام کے ساتھ وہی کیا ہے جو ایک شاطر جواباز جاسوس کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی اس کو غلط سراغ پر لگا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اب بے چارہ سراغ رساں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ سب جانتے ہیں کہ حالی کا رنگ شاعری سرسید کی صحبت اور ان کے اثر سے بدلا۔ خود حالی جا بجا اس کا کھلے الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔ مسدس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جوانان
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

بعض وقت بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش اس دل کو اس دیرینہ سال پیر سے کبھی سابقہ نہ پڑا ہوتا اور اس کو چھوڑ دیا جاتا کہ وہ خوبرو جوانوں میں رم کرتا رہے۔ اس وقت اس کی بے رنگی بھی کیفیت سے خالی نہ ہوتی۔"

(تنقیدی حاشیے۔ صفحہ ۲۲۷ و ۲۲۸)

حالی جب جدید رنگ کی طرف مائل ہوئے تو ان کی غزلوں میں وہ لطف نہ رہا جو قدیم غزلوں میں تھا۔ اب شعریت پر مقصدیت غالب آ گئی تھی۔ وہ چیز غزلیں پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس دور کی غزلوں پر کافی اعتراض کیا ہے۔ حالی ہی کی عبارت اس اعتراض کا جواب بنے گی۔ یہ عبارت حالی کی مشہور تصنیف یادگار غالب سے نقل کی جا رہی ہے۔ "یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی کثرت و قلت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اشعار کس درجہ کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے، بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں، اسے ریختہ کے تمام شاعروں کا سرتاج بنا دیا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ تمام شعراء کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا۔"

حالی کے تغزل پر فیصلہ دینے سے پہلے اس بیان کو سامنے رکھنا چاہئے اور تب حالی پر تنقید کرنی چاہئے۔ حالی کے نہ جانے کتنے اشعار ایسے ہیں جو اردو کے بہترین

(ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۹)

مسئلہ زبان

متین طارق

زبان کے مسئلے کا تعلق اگرچہ لسانیات سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا پھیلاؤ اور اثر بڑا عظیم ہے۔ انسانی تمدن، انسانی تاریخ، مذہب اور سیاست حتیٰ کہ بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اسی لئے زبان کی اشاعت ہر اس قوم کے لئے ضروری ہے جو دنیا میں فروغ چاہتی ہے یوں بھی انسان کے لئے اشرف المخلوقات ہونے کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زبان جیسی نعمت سے نوازا ہے جس سے دوسری مخلوق نا آشنا ہے۔

زبان کی قوتیں بے پایاں ہیں اس کے حدود ایک طرف روحانیت سے ملتے ہیں اور دوسری طرف زندگی کی کشمکش سے۔ یہ اظہار خیال کا ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ انسانی جذبات و احساسات کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ روحانی علم و عرفان کو بیان کیا جا سکتا ہے باطنی حق و ادراک کو دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ نیز اس کی ترویج سے ادب جیسا [illegible] ظہور میں آتا ہے جو بذات خود تحلیل نفسی کی اساس اور لطافت تہذیب انسانی کو مدت العمر تک محفوظ رکھنے کا وسیلہ بھی ہے

اسی لئے ماہرین علم انسان کا کہنا ہے کہ زبان کے ذریعہ کسی بھی قوم کی اخلاقی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور اجتماعی زندگی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ ہر قوم کی زبان میں ان تمام اعمال کا عکس ہوتا ہے جو اس نے ماضی میں انجام دئے ہیں اگر کسی زبان میں طاقت، قوت اور عقلمندی ہوگی تو اس کے بولنے والے بھی مضبوط کیریکٹر کے ہوں گے۔ لیکن اگر کسی زبان میں پیچیدگی اور تکلف ہوگا تو وہ اس کے قلبی الجھاؤ کا پتہ دیتی ہے۔

اس کی تحقیق پرانی زبانوں کا لٹریچر دیکھنے سے بھلی بھانتی ہو سکتی ہے کہ وہ کس طرح نہ صرف اپنی اپنی قوم کی خصوصیات و روایات کا حامل ہے بلکہ اپنے ماحول کے دوسرے واقعات کو بھی اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین زبانیں عبرانی و سنسکرت ہیں آج ان کا سمجھنا گو کتنا ہی دشوار ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اب بھی وہ اپنے بولنے والوں کے شوکت کلام اور اندرونی محاسن کی آئینہ دار ہیں اور اگر اس عہد عتیق کے لوگوں کے کردار و حالات کا کچھ ہمیں پتہ لگ سکتا ہے تو اسی دفتر زبان کے وسیلے سے۔ چنانچہ جس قوم نے اپنی زبان کے ادب کو محفوظ رکھا اس کی روایات ہمیشہ محفوظ رہیں اور جس نے اس کی طرف سے بے اعتنائی برتی اس کا نام بھی صفحۂ روزگار پر باقی نہ رہا۔

مختلف زبانوں کی کھوج کے بعد محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تمام زبانیں مستقل طور پر بیک وقت ایجاد نہیں ہوئیں بلکہ کے بعد دیگرے ایک ہی زبان سے نکلتی بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہی ہیں زبانوں کی لفظی مشابہت اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے آج گو بہت سی زبانیں اپنا مستقل وجود اور وقار رکھتی ہیں۔ ان کے بولنے والے اپنی اپنی زبان کو الہامی سمجھتے ہیں یا دوسرے میل کہتے ہیں مگر کبھی کبھی مشابہ الفاظ اس کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی مختلف شاخیں ہیں جو امتداد زمانہ سے اپنی اصلیت کھو کر موجودہ صورت اختیار کر چکی ہیں۔ ان کے بولنے والے کبھی ایک جگہ رہتے سہتے ہوں گے مگر ضرورت وقت سے وہ الگ ہو گئے ماحول اور آب و ہوا کے باعث زبان میں کچھ معنوی اور صورتی تبدیلیاں ہوئیں جن کو آج الگ الگ وجود دیدیا گیا ہے

مگر یہ امر واقعہ ہے کہ جب یہ مختلف قومیں مختلف زبانوں اور تمدنوں کے ساتھ کہیں پھر ملتی ہیں تو بعید ترین اشتراک ان کے احساسات کو ابھار دیتا ہے۔ انہیں باہم اشتراک پر مجبور کرتا ہے اور کم از کم اظہار خیال کے لئے تو راہ ہموار کر ہی دیتا ہے۔

اس خونی رشتہ اور نسلی اتحاد کے علاوہ کبھی کبھی پڑوسی زبانوں کے ایک ساتھ رہنے سہنے کے سبب آپ سے آپ بھی شکست و ریخت اور تعمیر و قبول کا عمل ہوتا رہتا ہے آپس کے میل جول سے کبھی کچھ لفظ قبول کئے جاتے ہیں کبھی کچھ اسلوب اپنائے جاتے ہیں۔ ہاں اسمیں جو زبانیں ذرا

زیادہ قوی ہوتی ہیں ان کی چھاپ بہت گہری ہوتی ہے بیزاکثر کمزور زبانیں چالو زبانوں کا سہارا لیکر اپنے آپ کو جینے کے قابل بناتی ہیں۔

کبھی کبھی یہ باہمی اختلاط اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ایک نئی زبان کی تخلیق شروع ہو جاتی ہے جس کا ابتدا میں احساس بھی نہیں ہوتا مگر فطرت کا ہاتھ چپکے چپکے اپنا کام کرتا رہتا ہے اس کی ظاہر ہیئت سے خوف کھا کر اہل علم پہلے پہلے الگ ہی رہتے ہیں اور اپنے خیال میں اس کو غیر زبان سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں۔ اپنی بولی اور اپنی زبان کو اس کی چھوت سے بچاتے ہیں مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بالکل نرالا ہے۔ ضرورت کے وقت بس بولے بن نہیں پڑتا، منہ پر تالا نہیں لگایا جاسکتا چپ سادھ کے نہیں بیٹھا جاتا آخر بولنا ہی پڑتا ہے۔ اپنی بات کو سمجھانا اور دوسروں کے مطلب کو سمجھنا بھی پڑتا ہے اس مجبوری کے صاحب آبحیات نے کئی سبب بیان کئے ہیں جو معلومات و دلچسپی سے خالی نہیں، فرماتے ہیں:۔

۱۔ اول تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔

۲۔ اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں اُن ہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے پھر بھی وہ لطف آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے اس صورت میں گویا قانون زبان اور آئین زبان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔

۳۔ جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اس لطف کو جانتے ہیں کہ جب دو غیر زبان والے ایک جگہ رہتے ہیں تو کبھی کام کاج کی شدت اور مصروفیت کبھی اُسی عالم میں ضروری بات جلد کہہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اُس کے گزارہ نہیں۔

۴۔ پھر جب ایک جگہ رہتے سہتے لوگ باہم شیر و شکر ہوتے ہیں تو اکثر پیار محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش کرتے ہیں جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح اُن کی زبان اپنے مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔

۵۔ بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات کو لباس، دستار، گفتار، رفتار، کو بھی اُسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور لوگ اُسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اُس پر فخر بھی کرتے ہیں پھر اُسمیں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

(آبحیات)

اس تحقیقات سے زبانوں کے بارے میں بہت سے تعصب ختم ہو جاتے ہیں اور ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کوئی بھی نئی پرانی، دیسی پردیسی، اپنی پرائی زبان نفرت کے قابل نہیں۔ ان میں ماں بیٹی بہن کا سا تعلق ہے یہ تعلق کسی طرح بھی کاٹا نہیں جاسکتا جو لوگ زبانوں کو الگ الگ ثابت کرنے کے خبط میں مبتلا ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ زبان کی زندگی میں نئے الفاظ نئے معانی اور نئے اسالیب برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں ایک زندہ زبان انہیں اپنانے سے نہیں ڈرتی جو زبان اپنی سالمیت ختم ہو جانے کے ڈر سے انہیں اپنانے سے پرہیز کرتی ہے یا پابند رسوم ہے وہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اکاش بانی سمجھتی ہے وہ بہت جلد بیمار ہو کر سوکھ جاتی ہے اس کو ہم شیشہ کے مکان سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کو دور سے دیکھا تو جا سکتا ہے مگر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

زبان کے پاس سب سے بڑی سند قبول عام کی ہوتی ہے نہ کہ بھاری بھرکم الفاظ کے ذخیرے اور پیچیدہ طرز کی۔ کسی زبان کا جتنا زیادہ استعمال ہوتا ہے اتنی ہی ہمہ گیری سے وہ زندہ ہے جتنے محدود حلقے میں وہ بولی جاتی ہے اتنی ہی وہ مردہ ہے بے سکت ہے۔ اور بے مصرف ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ سے موٹی سی لغت تو تیار ہو جاتی ہے مگر زبان کا حسن دو قار خاک میں مل جاتا ہے۔ سادگی، آسان فہمی اور لچک ہی کسی زبان کی ترقی کی ضمانت ہیں۔

اس سے اس بات کی نفی بھی ہو جاتی ہے کہ قانون کے ذریعہ کوئی زبان عوام پر ٹھونسی جاسکتی ہے بلکہ برعکس اسکے عوام جس زبان کو چاہیں اُسے اپنا سکتے ہیں۔ ہر زبان اپنے سانچوں میں ڈھلتی ہے۔

پروان چڑھتی ہے آگے بڑھتی ہے۔ عوام اُسے بولتے ہیں نکھارتے ہیں، اور رگ وبار لانے کے قابل بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر طریقہ غیر فطری ہے۔ بیجا دباؤ ہے، ایک شدید ضد ہے ایک تلخ گولی ہے جس سے منہ خراب تو ہو سکتا ہے۔ لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ زبان کے مسئلے میں اگر شدت اعتبار کی جاتی ہے تو فرقہ پرستی کی خلیج نمودار ہو جاتی ہے کسی بھی ایک گروہ کی ٹھیکیداری زبان کی نمو کو ختم کر دیتی ہے اُس کی ترقی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور بہاؤ کے رک جانے سے تعفن ناگزیر ہے۔

ظاہر بات ہے کہ زبان قانون پاس کرنے یا ریزولیوشن بنانے سے نہیں بلکہ اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کرتی ہے اگر اس میں اثر پذیری، لچک اور قوت انجذاب موجود ہے تو پھر وہ آگے بڑھے گی ورنہ دب دبا کر پیچھے پڑی رہ جائے گی۔ اس وقت نہ انتہائی قوم پرستانہ زاویۂ نگاہ کام دے گا نہ کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع۔ اس کے لئے تو سب سے ضروری چیز یہی ہے کہ ہم دوسروں پر غم و غصہ کئے بغیر زبان کی بنیادی صلاحیتوں کو سمجھ کر اسے زیادہ سے زیادہ قابل استعمال بنائیں۔

یہ کچھ نئی باتیں نہیں کہی گئی ہیں بلکہ یہ زبانوں کی تاریخ کے بناؤ بگاڑ کی وہ حقیقتیں ہیں جو آج بھی بڑے بڑے کتب خانوں کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں۔

ابوالمجاہد زاہد

آرزوؤں کی یہ شام دیکھئے کب تک رہے
زندگی ناشاد کام دیکھئے کب تک رہے

سوزِ یقیں ناتمام دیکھئے کب تک رہے
آتشِ نمرود عام دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب تک رہے قید مقام و وطن
نکہتِ گُل زیرِ دام دیکھئے کب تک رہے

اہلِ نظر کے لئے دار و رسن، قید و بند
ظلم کا یہ اہتمام دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب تک رہیں مصلحت اندیشیاں
عقل جنوں کی امام دیکھئے کب تک رہے

اہلِ خرد میں مرے سوزِ غمِ عشق پر
بحث حلال و حرام دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب عام ہو جلوۂ حُسنِ حیات
ابر میں ماہِ تمام دیکھئے کب تک رہے

زندگیٔ زاہدِ غم زدہ تیرے بغیر
ایک شکستہ سا جام دیکھئے کب تک رہے

سردار جلیل ایم۔اے

بھرے جہان میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش میں ہوں مگر روشنی نہیں ملتی

یہ کیا اندھیر ہے یارب بہار میں بھی یہاں
گُلوں کے رُخ پہ ذرا تازگی نہیں ملتی

مذاقِ فطرتِ آدم بدل گیا شاید!؟
تکلّفات بہت۔ سادگی نہیں ملتی

ہمارا مقصدِ تخلیق، آخرش کیا تھا
اس ایک راز سے بھی آگہی نہیں ملتی

تجلّیوں سے جو خیرہ نہ ہو سکے اے دوست
مری نظر کو وہ تابندگی نہیں ملتی

نہ خُلق و لطف و عنایت نہ وہ رواداری
تمہاری پہلی سی اک بات بھی نہیں ملتی

تجلّیات بہر گام، صاعقے پیہم
مگر غضب ہے کہیں روشنی نہیں ملتی

تمہارے کلبۂ احزاں کا ذکر کیا اے جلیل
صنم کدوں میں بھی اب دلکشی نہیں ملتی

عرشی بھوپالی

○

ہر کفِ پا میں آبلے ہوں گے
رات بھر قافلے چلے ہوں گے

جب اسیرِ قفس چلے ہوں گے
ہاتھ صیّاد نے مَلے ہوں گے

کتنے کانٹے بچھے ہیں راہوں میں
کس طرح راہرَو چلے ہوں گے

قیسؔ و فرہادؔ بن سکیں گے وہی
جو محبّت میں دل جَلے ہوں گے

دیکھ رندوں کو منّت حقارت سے
اِن میں کتنے ہی منچلے ہوں گے

جو اجل سے ملا رہے ہیں آنکھ
عشق کی گود میں پَلے ہوں گے

جانے کیا مجلسِ ہوس میں ہم
اپنی قسمت کے فیصلے ہوں گے

نجم الاسلام

○

آغاز ہی جن کا ٹھیک نہیں اُن کا نہ ہو کیوں انجام غلط
اُنکی نہ ہو کیوں ہر بات غلط، انکا نہ ہو کیوں ہر کام غلط

رستے میں کوئی سوتا جو ملا کی ہیں نے ملامت اور کہا
منزل پہ پہونچنے سے پہلے اے ننگِ سفر آرام غلط

میخانہ سے لیکر مسجد تک ہر گوشۂ ہستی ہے ابتر
تنظیمِ حرم درہم برہم، تقسیمِ شراب و جام غلط

اے اہلِ خرد سبحان اللہ کیا کہنا تمہاری منطق کا
اک عقل کی لغزش کے آگے موقوف وحی؟ الہام غلط؟

کہنا تو بہت کچھ ہے لیکن اُس شوخ سے کس حکمت سے کہوں
توضیح بھی کچھ بر محل نہیں اور اس سے سوا ابہام غلط

ناقد! تری ہر تنقید بجا کچھ کر کے نمونہ بھی تو دکھا
کہنا تو سبھی کو آتا ہے یہ کام غلط، وہ کام غلط

ہر رنگ مناسب اپنی جگہ اور اک حد تک ہر طرز بجا
یکسر تہ تو رنگ خاص غلط، اور نجمؔ نہ رنگِ عام غلط

محمد نیاز

○
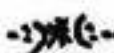
ذراسی بات پہ کہ سر گراں ہونا قیامت ہے
موافق دوستوں سے بدگماں ہونا قیامت ہے

سلام اے ضبط اے بندِ تکلّف، اے ادب رخصت
زباں رکھتے ہوئے تو بے زباں ہونا قیامت ہے

مجھے پھر وحشتِ غربت نے پکارا میزباں میرے
اب ایسے میں کسی کا میہماں ہونا قیامت ہے

مصیبت میں تمہی ناکامیاں ہی نوجواں لیکن
فقط، ناکامیوں پہ نوحہ خواں ہونا قیامت ہے

نشیمن پھونک دو رکھ دو قفس میں لا کے بلبل کو
مگر اس شوخ کا محوِ فغاں ہونا قیامت ہے

مسافر تیری منزل تیرے پیچھے رہ گئی شاید
بایں وحشت امیرِ کارواں ہونا قیامت ہے

منظر اعظمی

○

نہ زلفِ منتشر نے چشمِ نم کی بات کرتے ہیں
فقط اِک پیکرِ حُسن و کرم کی بات کرتے ہیں

ہمیں طاؤس و بربط کی فسوں زائی نہیں بھاتی
مگر ہم نغمۂ لوح و قلم کی بات کرتے ہیں

خدایانِ خرد بھی علم کی اِن خانقاہوں میں
لب و رخسار و دندانِ صنم کی بات کرتے ہیں

"جہانِ پیر" کی مردہ نگاہی خود بتائے گی
کہ ہم "سونیلئے الطاف و کرم" کی بات کرتے ہیں

خدا معلوم یہ دادِ سخن کیا گُل کھلائے گی!
سُنا ہے وہ مرے زورِ قلم کی بات کرتے ہیں

حیاتِ مبتلا اک شیوۂ محبوب ہے منظر
وہ احمق ہیں جو اندوہ و الم کی بات کرتے ہیں

کیفی امروہوی

ہائے یہ شورشِ الم ہائے یہ گردشِ حیات
بھٹکے ہوئے ہیں کارواں، بہکی ہوئی ہے کائنات
تو ہے امیرِ کارواں، تو ہے امینِ زندگی
تو ہے جہاں کے واسطے تیرے لئے ہے کائنات
یادِ حبیبِ زندگی! تو ہے جوان آج بھی
کتنے گذر گئے مقام، کتنے ہوئے تغیرات،
عشق جمالِ زندگی۔ عقل جلالِ زندگی
اُس کا مقام باثبات، اِس کا مقام بے ثبات
بیں کر امامِ زندگی، تو کہ اسیرِ زندگی
تیری نظر میں تو ہی تو، میری نظر میں کائنات
سدرہ نشین طائرو! اور بھی کچھ مقام ہیں
رفعتِ منزلت نہیں تنہا ہی مقصدِ حیات
کیفی رہِ حیات میں ایسے بھی کچھ مقام ہیں
روح طلب ہو زندگی، خام ہوں گر تصورات

مضطر مرزاپوری

میں اس جہاں کو جو چھوڑوں تو کس جہاں کے لئے
کوئی بتلائے تو گوشہ کہیں اماں کے لئے
مکیں مکاں کے لئے راز رازداں کے لئے
تمہارا غم ہے ضروری بقائے جاں کے لئے
کسی کے نقشِ کفِ پا کا نور کیا کہئے
ہر ایک گام پہ رہبر ہے کارواں کے لئے
تمہاری راہگذر کی سمجھ کے اک تصویر
نظر نے بوسے بصد شوق کہکشاں کے لئے
یہ بندشیں مری نظروں پہ تا بہ کے آخر
تڑپتا ہے مرا دل حسنِ لامکاں کے لئے
بہارِ لالہ و گل ہے چمن چمن لیکن!
ترس رہا ہوں گلستاں میں آشیاں کے لئے
شکایتیں غمِ دوراں کی تا بہ کے مضطر
زباں دہن میں ہے رنگینیٔ بیاں کے لئے

محمد عزیز، ایم - اے

اُف یہ کُتّے

"ارے یہ تمہیں نیند آنے لگی؟" مُسٹنڈے نوجوان نے مُنہ سے پان کی پیک پونچھتے ہوئے ساتھ والی سہمی ہوئی مگر بظاہر خوش نوجوان عورت سے پوچھا۔

سکنڈ شو ختم ہونے کے بعد جب مجمع نکل چکا تو یہ تین آدمی بھی آہستہ آہستہ چل رہے تھے، سفید لباس میں ملبوس، ایک عورت کے ساتھ دو مرد تھے۔

سینما بلڈنگ کے آس پاس بیٹھنے والے خوانچہ فروش بھی اب اونگھ کر بچا کھچا سامان بیچ رہے تھے۔

"نہیں جی، ٹھیک تو ہوں۔" عورت نے صفائی پیش کی اور مضبوط قدم کے ساتھ چلنے لگی۔

"گلستاں" کی حدود سے نکل کر انہوں نے ریلوے کراسنگ عبور کی اور اب نواب پور روڈ پر آ چکے تھے۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر کیچڑ ہو گئی تھی اور یہ لوگ سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ سڑک پر سناٹا ہو گیا تھا کتّے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے رکشہ اسٹینڈ بھی خالی ہی تھا، دو ایک رکشہ والے سڑک پر خالی رکشہ دوڑا رہے تھے، پولیس پوسٹ پر ٹریفک کے سپاہی کی جگہ ایک پاگل بیٹھا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ دوا کی دوکانیں اب بند ہو رہی تھیں، صرف ڈے اینڈ نائٹ فارمیسی پوری طرح کھلی تھی اور یہ لوگ آہستہ آہستہ چل رہے تھے، خاموشی سے کہ یکایک دوسرے مرد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے پوچھا،

"ہاں تو کہو کیسا لگا سینما؟" پھر خود ہی بولنے لگا "گلستاں میں کھیل اچھے ہی آتے ہیں ڈھاکہ کی ناک ہے۔"

"ہاں، اچھا لگا۔" عورت نے بے اعتنائی سے یوں ہی جواب دیا۔ "کتنی جلدی جلدی شکلیں نظر آتی ہیں۔"

"یہ بیگ ایسے سڈول تھوڑا ہی چلتے ہیں؟" مُسٹنڈے مرد نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کر کے کہا کہ کوئی راہ گیر سُن تو نہیں رہا ہے۔ "تمہیں اِس دن میں نے بتایا نہیں تھا جس دن ہم لوگ ڈھاکہ کلب کی طرف سے گذر رہے تھے۔"

"بڑے بڑے افسروں کی بیگمات کس طرح بیگ لے کر چلتی ہیں۔"

"اونہہ، ہوگا بھی۔" عورت نے ایک پان کی دوکان سے گذر کر آہستہ سے کہا۔ "تم تو بس کسرت ہی کرانا چاہتے ہو۔"

"ہی ہی ہی" مرد اپنی دوست سے یہ فقرہ سُن کر بہت خوش ہوا۔

"یہ تم اُدھر کیا دیکھ رہی ہو؟"

عورت کی نظر ملک تھیٹر پر جم رہی تھی، ایک عورت اپنے بچے کو چُپ کرا رہی تھی۔ "اے میری بچی بھی گھر میں اکیلی ہوگی۔ میں بھی کیا۔۔۔" عورت پر کچھ گھبراہٹ اور تشویش کے آثار پیدا ہو رہے تھے "عصمت کو یاد کر رہی ہو کیا؟" دُبلا والا مرد بولا۔ "چھوڑو بھی، ذرا بیگ تو ٹھیک کر لو۔"

"لو" اور عورت نے سچ مچ اپنے ہاتھ کو موڑ کر جسم پر زاویۂ قائمہ سا بنایا اور بیگ کو سامنے کی طرف نمایاں کر کے لٹکایا۔ سفید لباس پر سیاہ مخمل کا بٹوا خاصا نمایاں تھا، "اب تو خوش ہو؟" وہ کچھ جھنجھلاتی ہوئی بولی، جیسے متضاد جذبات کام کر رہے ہوں۔

"ہاں! شاباش" دُبلے مرد نے داہنی طرف آ کر کہا۔ "اب تم کو دیکھ کر کوئی یہ تھوڑا ہی کہہ سکتا ہے کہ تم ایک بڑے افسر کی بیگم نہیں ہو۔"

"اچھا! اب بس کرو بیکار کی باتیں ہیں۔" عورت کچھ نادم

سی ہوئی اور اس نقل پر داد ملنے سے اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ "چلو اب واپس، بہت دیر ہو چکی ہے"۔

"واپس؟" دُبلے مرد نے تعجب سے پوچھا "اتنا جلدی"

"اونہہ، اور کیا" عصمت کی ماں نے کہا "تمہارے کہنے سے پہلی بار یہ غلطی کی کہ رات کو گھر سے نکلی اور وہ بھی بچی کو چھوڑ کر"

"ابھی سے، ہا ہا ہا" مسٹنڈا مرد بولا۔ "ابھی اتنی جلدی کیسے کسی شریف بیگم کو آجکل دو بجے سے پہلے گھر واپس ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"ہی ہی" دوسرے مرد نے کہا "اُس دن ہی تو سکریٹری صاحب کا ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ صاحب تو ڈیڑھ بجے سے پہلے گھر آتے ہی نہیں اور بیگم صاحبہ بھی دو ڈھائی سے پہلے کبھی نہیں آتی ہیں؟"

"ہاں تو اب کدھر چلیں؟" سنسان کے پاس سے راہ پر پہونچکر مسٹنڈے مرد نے اپنے دوسرے ساتھی سے پوچھا۔

"کاش ہم لوگ بھی افسر ہوتے تو کلب کے اندر جا کر مزے کرتے"۔

"یار کیا بنا ہیں انگلش بھی تو ہمیں آتی" دوسرا بولا "ورنہ کس بات کی کمی ہے۔ دکان چلتی ہے، پیسہ کی کمی نہیں"

"ہاں استاد"۔

"کیا بکواس کر رہے ہو"۔ عورت نے ان تمام باتوں سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا، "چلئے، واپس چلو" اور وہ آنچل برابر کرتے ہوئے بولی جو بار بار سرک جاتا تھا۔

"یہ کیا پگلی"۔ مرد نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "ارے اب بار بار آنچل درست کرنا کوئی ضروری ہے کیا، جانتی نہیں ہو، اب بیگمات ایسا نہیں کیا کرتی ہیں"۔

"اب تو بھائی بہت تھک گئی ہوں" عورت کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں "جلدی چلو"۔

"ارے کچھ سستا نہیں"۔ دُبلے مرد نے بڑی عیاری سے مشورہ دیا، "چلیں، "ممتاز محل" میں چائے نہ پی لیں؟"

"ہاں کلب نہیں تو یہی سہی"۔ دوسرے نے شہ دی "یہ بات کہی ہے استاد، فسٹ کلاس" "چلو اندر چلو عصمت کی ماں"۔

"سنو بھائی یہاں عورتیں وورتیں نہیں آنے پاتیں"۔ ہوٹل کے بیرے نے تیزی سے دروازہ پر آکر کہا۔ "اور وہ بھی رات میں، ایسی ویسی عورتیں"۔

عصمت کی ماں کا دل بھر آیا اور وہ مجسمہ بنی کھڑی تھی، اُس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جائے لیکن دلدل میں قدم رکھنے کے بعد مزید دھنسنا ہی ممکن ہے نکلنا نہیں۔

"ابے کیا سوچ رہی ہو آؤ اندر" مرد داخل ہو گیا اور پانچ کا نوٹ بیرے کے ہاتھ میں پہونچ چکا تھا۔

اور اب تینوں بیٹھے ہوئے تھے۔

"چائے دیں صاحب؟"

"ہاں اور تم لوگوں کے پاس ہے ہی کیا" مرد نے گویا تحقیر کرتے ہوئے کہا "وہ پانی ہے"۔

"کون پانی صاحب؟" بیرے نے پوچھا "سوڈا واٹر"

"ہشت، بدھو" مرد نے جواب دیا "تم لوگ نئے شہر سے دور رہتے ہو۔ جاؤ چائے لاؤ اور ساتھ میں کچھ مٹھائی بھی سموسہ تو ہوگا نہیں؟"

"جی نہیں صاحب" اور تھوڑی دیر بعد تین گرم گرم پیالیاں میز پر رکھی تھیں اور ساتھ میں ایک پلیٹ میں تین چار مٹھائیاں

"ٹن ٹن ٹن، بارہ بار گھڑیال بولا۔

"ارے تم نے چائے نہیں لی"۔ دُبلے مرد نے عورت سے پوچھا

"بس چلو" عورت نے پریشان ہو کر کہا اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی

"اب میں جلد گھر جاؤں گی۔" اُسے بار بار کچھ بدگمانیاں اور اندیشے ہو رہے تھے۔

آخر کار سب اُٹھے۔

"ارے گجب"۔ سامنے دوکان کو بند کرتا ہوا ایک کمسن لڑکا بڑی دیر سے اِدھر گھور رہا تھا۔ فلورسنٹ ٹیوب کی روشنی میں سفید جارجیٹ کی ساڑھی اور سفید ساٹن کے بلاؤز کے ساتھ چہرے کا پاؤڈر خوب چمک رہا تھا بے ساختہ وہ گانے لگا۔ "دیکھو تو" مگر کچھ سوچ کر رُک گیا۔

"عورت" یہ سُنکر اور بھی گھبرائی۔ مصیبت زدہ اور خا

عورت ہی تھی۔ اُسے ہمسایوں کی ہمدردی اور دور کی رشتہ داری کی یہ انوکھی قیمت نہ معلوم تھی۔ البتہ وہ بیوگی کے خلاء کو ان لوگوں کے ساتھ ربط ضبط کے ذریعہ پُر کرتی رہی تھی۔

"ارے سُنتے ہو میں اب فوراً جاؤں گی" عورت کے اندر بالآخر حیا کا جذبہ عود کر آیا۔ "تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں"

"ہی ہی ہی"

"یہ آخر اتنے پیسے جو اتنے دنوں سے خرچ کر رہا ہوں" مرد کے اندر سے شیطان بولا۔ "کیا میں محض امداد کر رہا ہوں۔ یا کوئی خلیفہ عمرؓ ہوں کہ ایک بیوہ کی خواہ مخواہ مدد کروں۔"

"اچھا یہ بات ہے" عصمت کی ماں سٹ پٹائی ہوئی بولی، "تو تم نے شادی ہی کرلی ہوتی"

"دوسری شادی" مرد نے تعجب سے پوچھا "وہ تو گورنمنٹ نے منع کر دیا ہے، سکریٹری صاحب کا ڈرا مجھ کہہ رہا تھا"

"ہونہہ شادی" دوسرے مرد نے کہا "تو ہمیں کر بیٹھیں۔ دس سال سے زیادہ ہوئے جب علیم الدین بھائی کا انتقال ہوا"

اُسے ایک دھکا سا محسوس ہوا کہ وہ کیوں تحائف قبول کرتی رہی اور معصومی سے دور کے چچا زاد بھائی کی ہمدردی کا شکار ہوتی رہی اور ٹیڑھے راستہ سے اپنی زندگی کے پیدا شدہ خلاء کو پُر کرتی رہی۔

وہ آگے بڑھ کر رکشہ والے کو پکارنے لگی، اب اُسے مزید انتظار منظور نہ تھا، وہ بالکل تھک چکی تھی۔

"اچھا یہ ٹھاٹھ ہیں" مرد نے کہا "آپ چلیں"۔

"ہم لوگ تاجر ہیں" دوسرے نے کہا۔ "پیسہ لگا کر نقصان تھوڑا ہی سہہ سکتے ہیں"۔

وہ تیز چل کر رکشہ پر سوار ہو جانا چاہتی تھی، جو اتفاق سے قریب ہی موجود تھا۔

پیں پیں، بھوں بھوں، رکشہ کے قریب وہ لڑکھڑاتی ہوئی پہونچی، وہ پائیدان پر پاؤں رکھنا ہی چاہتی تھی کہ لڑکھڑا کر زمین پر آرہی، پاس ہی ایک کتیا کے ساتھ دو کتے کھڑے تھے۔ عصمت کی ماں نے اُن سے ٹھوکر کھائی اور وہ "پیں پیں" کرتے ہوئے ادھر اُدھر بھاگے۔

فوراً ہی ایک کار تیزی سے گذر گئی جس سے مردانہ زنانہ دونوں آوازیں آرہی تھیں۔ کتے دور کھڑے بھونک رہے تھے۔

وہ عصمت کو لے کر اُٹھی اور رکشہ میں سوار ہونا ہی چاہتی تھی کہ وہ دونوں مرد [illegible] اور وہ ایک دم مضبوط [illegible] تھی۔

"اُف یہ کُتّے!" بے بس عورت کے منہ سے نکلا۔

سامنے پان کی دوکان پر کھڑا پولیس کا سپاہی مزے کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا اور ایک کمسن لڑکا گاتا ہوا چلا جا رہا تھا! "جائیں تو جائیں کہاں"

منظر حسین

یہ دفتر ہے

فرض کیجئے آپ کسی دفتر میں کلرکی کے "اُمیدوار" ہیں۔ اب آپ سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ اس دفتر میں اپنے کسی رشتہ دار یا دوست یا دوست کے دوست کو تلاش کریں گے۔ آپ کی زبردست خواہش یہ ہوگی کہ "صاحب" کا چپراسی کسی صورت سے آپ کا قریبی عزیز نکل آئے اور اس کے لئے آپ ایسا توڑ جوڑ کریں گے اور ایسے داؤں پیچ ماریں گے کہ بے چارہ چپراسی واقعی آپ کو اپنا سب سے بڑا عزیز سمجھنے لگے گا اور اگر یہ نہ سمجھے گا تو کم از کم یہ تو ضرور سوچنے لگے گا کہ آپ بھی اسی آدمؑ کی اولاد ہیں جس کی وہ خود ہے۔ لیکن خدانخواستہ آپ کو اس میں ناکامی ہوئی تو پھر آپ سپرنٹنڈنٹ یا کسی ماتحت افسر سے رشتہ گانٹھنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ادھر سے بھی آپ دھتکارے گئے تو پھر آپ اپنی قسمت پر شاکر ہو کر کلرکوں کے درمیان ہی "رشتہ داری" ڈھونڈھیں گے۔ رشتہ داری نہ ہی دوستی۔ دوستی نہ ہی 'دوست کی دوستی'۔۔۔ یعنی آپ اپنی اوریجنل پالیسی پر آجائیں گے۔ اب ظاہر ہے کہ اتنے بڑے دفتر میں ایک آدھ آدمی آپ کا رشتہ دار، دوست یا دوست کا دوست بننے پر تیار ہو ہی جائیگا۔ آپ اس کے پاس جائینگے اور کہیں گے۔ "بھائی صاحب۔ السلام علیکم" وہ جواب دے گا۔ "وعلیکم السلام"۔ آپ کہیں گے: "بہت دنوں سے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہوا۔ کدھر رہتے ہیں آپ آجکل؟" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گا: "یہاں دفتری زندگی میں پھنس کر آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔" آپ بھی ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہیں گے: "سچ ہے بھئی — سچ ہے"۔ اور پھر آپ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہیں گے۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی اس دفتری زندگی کو میں بھی دیکھوں۔" وہ بولے گا "خبردار۔ ادھر بھولے سے بھی قدم نہ رکھئے گا"۔ آپ کہیں گے "بھئی۔ قدم تو میں نے رکھ دیا ہے"۔ وہ پوچھے گا۔ "کیا مطلب؟" آپ جواب دیں گے: "مطلب یہ کہ میں نے کلرکی کے لئے درخواست بھیجی ہے"۔ وہ حیران ہو کر کہے گا۔ "درخواست؟" آپ مسکرا کر کہیں گے۔ "جی ہاں۔ میں نے ایک ہفتہ ہوا ایک درخواست بھیجی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کے دفتر میں کچھ جگہیں خالی ہوئی ہیں لیکن اس درخواست کا حشر کیا ہوا۔ یہ مجھے نہیں معلوم"۔ وہ آپ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بولے گا۔ "خالی درخواست؟" آپ اسے ایک عدد سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہیں گے: "جی بالکل خالی۔ لیکن میں اسکا پیٹ بھرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ۔۔۔۔" آپ یہ کہتے کہتے رُک جائیں گے اور وہ سوچنے لگے گا اور پھر سوچ کر کہیگا "اچھا۔ آپ مجھ سے گھر پر ملیں۔ آج شام کو سات بجے ــــ اور ایک نئی درخواست لکھ کر ساتھ لیتے آئیں کیونکہ پُرانی درخواست کا ملنا مشکل نظر آتا ہے"۔ آپ اسکا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ اور پھر اپنے گھر سے وقت مقررہ پر اس کے گھر ــــ وہ بڑے تپاک سے ملیگا اور کہے گا: "درخواست دکھائیے"۔ آپ درخواست پیش کرتے ہوئے کہیں گے۔ "دیکھئے میں الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوں اور چھ سال کا تجربہ بھی رکھتا ہوں"۔ وہ مسکرا کر کہے گا: "اچھا؟" اور پھر درخواست پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہے گا: "آپکی کامیابی مشکل ہی نظر آتی ہے"۔ آپ کا مُنہ لٹک جائیگا اور الہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ ہونے کا غرور اور چھ سال کا تجربہ رکھنے کا فخر مٹی میں مل جائیگا۔ وہ آگے کہیگا: "مشکل اسلئے کہہ رہا ہوں کہ جگہیں صرف تین ہیں اور اُمیدوار تین سو ــ اور ان تین سو میں تقریباً تیس اُمیدوار وزیروں، سیکریٹریوں، ڈپٹی سکریٹریوں، اسسٹنٹ سیکریٹریوں، افسروں۔ اور ایم۔ ایل۔ اے حضرات کے آدمی ہیں"۔ آپ کے مُنہ سے بے ساختہ "ارے باپ" نکل جائے گا۔ لیکن وہ پھر مسکرائیگا اور مسکرا کر کہیگا۔ "آپ مایوس نہ ہوں۔ کوشش کریں۔ ممکن ہے آپ کامیاب ہو جائیں"۔ آپکی باچھیں کھل جائیں گی اور آپ اس کی طرف یوں دیکھیں گے گویا کہ وہ فرشتۂ رحمت ہے۔ اور

پھر کہیں گے: "آپ جو حکم دیں میں کرنے کو تیار ہوں۔" وہ آپ کے قریب
جھک کر تقریباً آپ کے کان میں کہے گا۔ "کیا آپ پانچ سو روپیہ کا
فوری بندوبست کر سکتے ہیں؟" آپ کہیں گے۔ "باپ رے باپ۔ پانچسو!"
وہ کہے گا: "پانچسو نہ سہی، چار ہی سو سے کام چل جائیگا۔" آپ پھر
کہیں گے: "باپ رے باپ چار سو؟" وہ کہے گا: "چار سو نہ سہی، تین ہی
سو دیدیجئے۔" آپ پھر کہیں گے: "باپ رے باپ۔ تین سو؟" وہ کہے گا۔
"تین سو نہ سہی، دو سو سہی" آپ پھر کہیں گے۔ "باپ رے باپ . . ."
وہ جھنجھلا کر آخری بولی بولے گا۔ "ڈیڑھ سو روپیہ اس سے کم میں کچھ نہیں
ہو سکتا، کیونکہ پچاس روپیہ Estab. Clerk لے گا اور
پچاس . . . " آپ مجبور ہو کر کہیں گے۔ "منظور ہے منظور" وہ پوچھے گا
"کب دیں گے؟" آپ کہیں گے "کل شام کو میں اپنے دوستوں سے
قرض لیکر آپ کی خدمت میں یہ رقم پیش کر دوں گا۔" وہ کہے گا: "کل شام
کو ضرور لائیے۔ ورنہ آپ کا کام مشکل . . . . " آپ کہیں گے: "بہت
بہتر۔ بہت بہتر۔" اور پھر دوسری شام کو آپ ڈیڑھ سو روپیہ اس کے
حوالے کر کے کہیں گے: "کیا میں اس کی امید رکھوں کہ آپ . . . "
وہ آپ کی بات کاٹ کر کہے گا: "قول مرداں جان دارد۔ آپ مطمئن
رہئے تین جگہوں میں سے ایک جگہ آپکو دلائی جا چکی ہے۔" آپ اسکا
شکریہ ادا کر کے چلنے والے ہی ہوں گے کہ وہ پوچھے گا: "آپ کے پاس
ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا تعارفی کارڈ تو ہوگا ہی؟" آپ کہیں گے: "نہیں
میں ادھر گیا ہی نہیں۔" وہ کہے گا: "تو کل صبح جائیے اور وہاں سے تعارفی
کارڈ لیکر آئیے۔ ورنہ سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائیگا۔" آپ قدرے
حیران ہو کر دریافت کریں گے "اس کی کیا ضرورت ہے جبکہ میری درخواست
موجود ہے" وہ جواباً عرض کرینگے: "بھئی یہ تمام درخواستیں بیکار ہیں
سرکاری نقطۂ نظر سے۔ جب تک کہ . . . " آپ کہیں گے۔
"اچھا تو میں کارڈ لے لوں گا۔"

اور دوسری صبح کو جب آپ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دروازہ پر لگی ہوئی
"ملتی کیو" میں جا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد آپکو ایک بابو دفتی
کا بنا ہوا ایک ٹکٹ دیگا جس پر ۳۹۹ نمبر پڑا ہوگا۔ آپ اس ٹکٹ کو لے کر
محسوس کرینگے جیسے آپ کو بہت بڑی دولت مل گئی ہو کیونکہ یہ ٹکٹ اس
بات کا ضامن ہوگا کہ آپ کو ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کسی سرخ یا سفید لفافہ
میں بند کرکے "کلرکوں کے خزانے" میں ڈالو دیجئے۔ ہاں تو جب آپ
اس ٹکٹ کی افادیت پر غور کر رہے ہوں گے تو اسوقت آپکی "کیو"
چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہوگی اور اسی رفتار سے شام آ جائیگی۔
اور آپ سے کہا جائیگا "دوسرے دن آؤ" غرضکہ آپ کئی صبحیں،
کئی شامیں گذارنے کے بعد اس کمرے میں داخل ہوں گے۔ جہاں
ٹکٹ والا بابو بیٹھا ہوگا۔ وہ آپ کے ہاتھ میں ایک سُرخ یا سفید لفافہ
تھما کر کہے گا: "اسے بھرو" اور آپ اسے بھرنے میں مصروف ہو جائیں
گے۔ اچانک آپ کا ایک ساتھی آپ سے پوچھے گا: "سطر نمبر ۳ کا جواب
کیا لکھا جائے؟" آپ کہیں گے "پہلے یہ بتائیے کہ میری مستقل جائے
سکونت کیا ہے؟" آپکا ساتھی آپکی طرف گھور کر کہے گا: "آپ کے سوا اسکو
کون بتا سکتا ہے؟" آپ کہیں گے: "میں رفیوجی ہوں اس لئے یہ
دقت پیش آئی" وہ بولے گا۔ "یہیں کا پتہ لکھ دیجئے"۔ آپ کہیں گے
"میرا پتہ روزانہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور یہاں مستقل درکار ہے"۔ وہ کہے گا۔
"کچھ لکھ بھی دیجئے۔ آپکو تو صرف کاغذ کا پیٹ بھرنا ہے۔" آپ اس کی
بات مان لیں گے۔ اور انٹ سنٹ لکھ کر لفافہ بابو کو واپس کر دیں گے۔
بابو آپ سے ٹکٹ بھی واپس مانگ لے گا۔ اور پھر آپ سے اس بینچ پر
بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہے گا جو منیجر کے پاس جانے والے لوگوں کے لئے
محفوظ ہوگی۔ آپ ابھی بینچ پر بیٹھے ہی ہوں گے کہ بابو آپکو بلا کر کہے گا۔
"مسٹر اس سطر کا جواب آپ نے غلط لکھا ہے۔" آپ دریافت کرینگے
"کونسی سطر کا؟" وہ بولے گا۔ "ذات والی"۔ آپ کہیں گے۔ "بھئی۔
اپنی تو کوئی ذات نہیں، اسلئے مسلمان لکھ دیا۔" وہ کہیگا: "نہیں۔
آپ کی ذات ضرور ہوگی؟ ــــ کیا ہے؟" آپ کہیں گے۔ "میں نے
عرض کیا نا کہ میری ذات کچھ نہیں ہے۔" وہ بگڑ کر کہے گا۔ "اے مسٹر
تمہیں ملازمت حاصل کرنی ہے یا نہیں؟" آپ اس شیر کی آنکھیں
دیکھ کر سہم جائیں گے اور کہیں گے: "آپکا جو جی چاہے لکھ دیجئے۔
میں تسلیم کر لوں گا کہ میں وہی ہوں" وہ قلم اٹھا کر "مسلمان کی جگہ"
"سید" لکھ دیگا اور آپکو دکھا کر کہے گا: "جائیے اس بینچ پر بیٹھ کر
انتظار کیجئے"۔ ــــ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد چپراسی آپ کا نمبر پکاریگا
اور آپ "اندر" داخل ہو جائیں گے۔ اندر داخل ہوتے ہی آپ کا
سامنا ایک "زنانی کم مردانی" آواز سے پڑیگا: "بیٹھ جائیے۔ آپکے
پاس سرٹیفکٹس ہیں؟" آپ جواب دینگے: "جی۔ میڈم" اور فوراً ہی
اپنی ذاتی فائل میڈم کے سامنے پیش کر دیں گے۔ میڈم پوچھیں گی۔ "آپ

ملائپ جانتے ہیں؟ آپ کہیں گے "تھوڑا تھوڑا" وہ کہیں گی "تھوڑا تھوڑا کیا — صاف کہئے کہ نہیں جانتے " آپ کہیں گے " تقریبا نہیں کے برابر" وہ بولیں گی " تو پھر نہیں افسوس ہے کہ اسوقت آپکو کوئی ملازمت نہیں دی جاسکتی " آپ کے دل پر برچھیاں سی چلنے لگیں گی اور آپ روہانسا ہوکر کہیں گے " میڈم — دفتر میں نئی جگہیں خالی ہیں۔ مجھے وہاں بھیجکر ممنون کیجئے " وہ کہیں گی " ہمیں اسکی کوئی اطلاع نہیں — چپراسی دوسرے آدمی کو بلاؤ۔ آپ چلتے چلتے میڈم سے کہیں گے۔ " میڈم پلیز میں بہت ضرورت مند ہوں۔ مجھے وہاں بھیجدیجئے — آگے میری قسمت ہے " وہ خفا ہوکر کہیں گی " میں نے کہدیا نا کہ وہاں کوئی جگہ خالی نہیں " اور آپ اپنا سا منہ لیکر کمرہ سے باہر نکل آئیں گے۔ باہر نکل کر آپ افسردہ دلی سے کہیں گے " ہائے میرے ڈیڑھ سو روپیے " اور آپ سے چلا نہیں جائیگا اور آپ ایمپلائمنٹ کے دروازہ سے ملی ہوئی پچھلی دلوار پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگیں گے — سگریٹ کا دھواں آپکے منہ سے آہوں کی طرح نکل نکل کر فضا میں پھیلنے لگے گا اور آپ کا دماغ " میڈم کی بچی کی " مرمت کی سکیمیں سوچنے لگے گا — آپ اسکیمیں سوچتے رہیں گے کہ میڈم کے گھر جانے کا وقت آجائیگا اور وہ اپنے کمرہ سے نکل کر کار میں، اور کار سے نکل کر گھر میں داخل ہو جائیں گی۔ اچانک آپکو ایک چپراسی کی آواز چونکا دے گی " گھر نہیں جانا ہے کیا آپکو ؟ " آپ چپراسی کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ وہ میڈم کا چپراسی ہے اور آپ اس سے بڑی نرمی سے پوچھیں گے۔ " بھائی یہ جو منیجر صاحبہ ہیں آپکی وہ کہاں رہتی ہیں ؟ " چپراسی آپکو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہے گا۔ " مجھے نہیں معلوم " آپ جھٹ ایک روپیہ کا نوٹ (اور ظاہر ہے کہ یہ روپیہ آپ نے کسی سے قرض لیا ہوگا) نکال کر چپراسی کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہیں گے۔ " بھیا مجھے ملازمت کی بہت سخت ضرورت ہے۔ منیجر صاحبہ کا پتہ معلوم ہو جائے تو میں ان کے گھر پر جاکر ان سے ملوں اور...... " چپراسی مسکرا کر کہے گا " منیجر صاحبہ گھر پر کسی سے نہیں ملتیں " آپ کہیں گے تو پھر کیسے ملا جائے " اور کہاں ملا جائے " وہ بولے گا " اس کی بالکل سیدھی سی ترکیب ہے۔ آپ اُن سے ملنے کی بجائے ان کے بھتیجی (Fiancee) سے ملئے چلئے میں ان سے ملا دوں مگر .... وہ اپنی بتیسی دکھا کر آپ سے مزید " اجرت " طلب کریگا "

اور آپ اسے کام ہو جانے پر " پانچ روپیہ " دینے کا وعدہ کرلیں گے — پندرہ میں منٹ کے بعد آپ " بھتیجی صاحب " کے گھر پہنچ جائینگے اور آپ کا چپراسی " بھتیجی صاحب " کے خانساماں سے کچھ سرگوشی کریگا اور آپکو اس کے حوالے کر کے چل دیگا۔ خانساماں موقع دیکھ کر آپ کا ذکر صاحب سے کریگا اور پھر آپکو ان کے دربار میں پیش کریگا۔ آپ اپنی مصیبتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرینگے اور دو تین موٹے موٹے آنسو بھی گرائیں گے، جس سے صاحب کے دل میں رحم پیدا ہوگا اور وہ آخر کار یہ کہیں گے کہ " اچھا مسٹر۔ میں تمہاری سفارش کر دوں گا " اور آپ صاحب کا صدق دلی سے شکریہ ادا کرکے باہر نکلیں گے اور خانساماں کے ہاتھ میں اپنی بچی کھچی پونجی دیکر گھر کا راستہ لیں گے۔

— اور پھر آپ دوسرے دن، میڈم کے چپراسی کو مبلغ پانچ روپیہ دیکر " لیلائے کارڈ " کو سینے سے لپٹائے، اپنے محبوب " دفتر سے محبوب " رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست سے ملیں گے اور وہ خوش ہوکر کہے گا " کارڈ مجھے دیجئے۔ اب آپ ۲۷ تاریخ کو انٹرویو کے لئے آئیے۔ " آپ اس خوشخبری سے خوش ہوکر اسے کارڈ کے ساتھ ساتھ ایک سگریٹ دیں گے اور ایک خود پئیں گے — اور پھر ۲۷ تاریخ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگیں گے۔

۲۷ تاریخ کو آپ مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھیں گے اور اُٹھ کر اپنے دانتوں کو برش سے مانجھ مانجھ کر خوب چمکائیں گے اور منہ کو صابون سے مل مل کر دھوئیں گے۔ اور پھر شیو کر کے آپ غسل کرینگے۔ غسل کر کے آپ اپنا بہترین سوٹ یا شیروانی پاجامہ صندوق سے نکال کر پہنیں گے — اور پہن کر آپ قریب ترین ہوٹل میں اچھا سا " مقوی " ناشتہ کرینگے۔ اور ناشتہ کر کے آپ تھوڑی دیر سیٹی بجائینگے اور سیٹی بجا کر آپ ملازمت کے حسین تصور سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور پھر آپ گھر جاکر اپنی فائل لیں گے اور ایک گھنٹہ قبل ہی دفتر پہنچ جائینگے۔ جہاں آپ سے پہلے ہی کچھ لوگ آئے ہوئے ہوں گے۔ آپ ان لوگوں میں گھل مل کر مزے مزے کی باتیں کرینگے۔ اور ہر ایک سے پوچھیں گے۔ " کیا آپکو کامیابی کی توقع ہے ؟ " اور جب آپ باتیں کرتے کرتے تھک جائیں گے تو ایک بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پئیں گے اور " ممکنہ سوالات " کے بارے میں سوچیں گے آپ سوچتے رہیں گے کہ ایک کار دندناتی ہوئی آئے گی جس میں سے " صاحب " بڑی شان سے اُتریں گے اور آپ اسے اترتے دیکھ کر بنچ سے اُٹھکر احتراما

کھڑے ہو جائیں گے۔ اور جب وہ گذر جائیگا تو آپ پھر اسپر بیٹھ جائیں گے آپ کا دل صاحب کے دیدار سے باغ باغ ہو جائیگا اور آپ اسے چپکے چپکے دل میں دعائیں دینگے۔ اور پھر جوں جوں وقت گذرتا جائیگا آپ کی دعائیں، بددعاؤں میں، بددعائیں گالیوں میں بدلتی جائیں گی۔ اور آپ انٹرویو کی طرف سے مایوس ہونے لگیں گے ــــ جب آپ مایوس ہونے لگیں گے تو پھر ایک چپراسی صاحب کے کمرے سے نکلے گا اور پکارے گا "فضل الٰہی حاضر ہے" فضل الٰہی سے انٹرویو شروع ہو جائے گا اور محمد مشکور پر ختم ہو جائیگا۔ غرضکہ "فضل الٰہیوں" اور "محمد مشکوروں" کے شروع اور ختم ہونے کے بعد آپکا نام "دوسرے یا تیسرے" دن پکارا جائیگا۔ اور آپ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے چہرے پر نہ تو پہلے دن جیسی چمک ہوگی نہ خوشی۔ بلکہ اسپر گھبراہٹ کے آثار ہی ہوں گے ــــ آپ کے پہنچتے ہی صاحب ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر آپ سے کہیں گے "دنیا کے سب سے اونچے مقام کا نام بتاؤ" اور ابھی آپکا جواب آپکے منہ کے اندر ہی ہوگا کہ دوسرا سوال ہوگا "ٹمبکٹو کہاں واقع ہے؟" اور پھر تیسرا "Precis کسے کہتے ہیں؟" اور پھر چوتھا "آئین سٹائن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اور پھر پانچواں "تم گدھے ہو گٹ آؤٹ ـــ" آپ اپنے گدھے پن پر کڑھتے ہوئے باہر نکل آئیں گے اور نکل کر اپنے رشتہ دار، دوست، یا دوست کے دوست سے ملیں گے اور اپنے گدھے ہونے کا ذکر کریں گے وہ ہنسے گا اور کہے گا "بھئی یہاں گدھے ہی چل سکتے ہیں اور کوئی نہیں ــ آپ مطمئن رہئے۔ ایک جگہ آپ کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔" آپ کہیں گے۔ "لیکن انٹرویو ــــ" وہ بولے گا "انٹرویو کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ کامیابی آپکے حصہ میں آچکی ہے۔" آپ اس کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھیں گے اور سوچیں گے "یہ بڑا گھٹا ہوا آدمی ہے۔ دیکھیں یہ کس طرح ملازم رکھواتا ہے۔" اور پھر کہیں گے۔ "تقرر کب تک ہوگا؟" وہ جواب دیگا "ایک ہفتہ کے اندر" آپ اسکا ہاتھ دبا کر کہیں گے۔ "شکریہ" اور پھر اپنے گھر کی راہ لینے والے ہی ہوں گے کہ وہ کہے گا "آپ نے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ (Domicile - Certificate) تو لے لیا ہوگا؟" آپ کہیں گے "نہیں" وہ کہے گا "تو پھر تقرر سے پہلے ہی لے لیجئے ورنہ سب کئے کرائے پر....." آپ کہیں گے۔ "بہتر ہے لے لوں گا۔"

اور آپ "C. D." کے چکر میں پڑ جائیں گے، اور اس چکر میں تو بیحد چکرائیں گے اور حاتم طائی کی طرح "یا اللہ مدد۔ یا اللہ مدد" پکاریں گے۔ آخر میں آپکو ایک "خضر راہ" بتلائے گا کہ جاؤ D.M. کے دفتر سے C.D. وہاں سے ملے گا۔ آپ D.M. کے دفتر کی عمارت تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن اندر قدم رکھنے کی جرأت آپ میں نہ ہوگی آپ باہر ہی باہر معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرینگے۔ لیکن معاملہ سلجھنے کی بجائے اُلجھنے لگے گا۔ آخر آپ ایک بابو نما چپراسی یا چپراسی نما بابو کو (جو کسی کام سے جا رہا ہوگا) روک کر کہیں گے۔ "بھیا مجھے C.D. حاصل کرنا ہے۔" وہ کہے گا "تو؟" آپ کہیں گے "تو سوال یہ ہے کہ وہ کیسے حاصل کیا جائے؟" وہ کہے گا "جیسے سب حاصل کرتے ہیں؟" آپ کہیں گے "سب کیسے حاصل کرتے ہیں؟" وہ کہے گا "وہاں سے (اشارہ کرکے) فارم لے لیجئے اور اسے بھر کر یہاں (اشارہ کرکے) مع فیس داخل کر دیجئے۔" آپ کہیں گے "بس؟" وہ کہے گا "بس" آپ کہیں گے "اور کچھ نہیں؟" وہ کہے گا "میرا مغز نہ کھائیے۔ اور کچھ بھی نہیں۔" وہ چلنے کے لئے پر تول رہا ہوگا (جیسے کہ اسکے واقعی پر ہوں گے) کہ آپ مبلغ ایک روپیہ نکالکر چپکے سے اسکی نذر کرتے ہوئے کہیں گے "بھئی۔ میں بہت غریب آدمی ہوں یہ بتائیے کہ کب تک مل جائیگا؟" وہ مسکرا کر کہے گا "میں کوشش کروں گا کہ آپکو دو ماہ کے اندر ہی مل جائے۔" آپکا ہارٹ فیل ہونے لگیگا اور آپکے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل جائے گی "دو ماہ؟" وہ کہے گا۔ "اس سے بھی زیادہ وقت لگتا ہے لیکن......" آپ کہیں گے۔ "دو ماہ تک کیا ہوتا ہے؟" وہ کہے گا "پولیس انکوائری" آپ کہیں گے "تب تو اپنا بیڑہ غرق ہو جائیگا" وہ پوچھے گا "کیوں؟" آپ کہیں گے "ایک ہفتہ کے اندر مجھے ملازمت پر جانا ہے۔" وہ کہے گا "اچھا ـ یہ معاملہ ہے؟" آپ کہیں گے "جی ہاں ـ یہی معاملہ ہے۔" وہ سوچ کر کہے گا "تو پھر شارٹ کٹ اختیار کیجئے۔" آپ کہیں گے "مطلب؟" وہ کہے گا "مطلب یہ کہ کچھ روپیہ خرچ کیجئے۔" آپ کہیں گے "میں بہت غریب ہوں۔ لیکن آپ بتائیں کتنے روپیہ سے کام چل جائیگا تاکہ میں اسکا بندوبست کروں۔" وہ کہے گا "یہی بیس تیس روپے" آپ کہیں گے "ٹھیک ٹھیک بتائیے۔" وہ کہے گا "تیس ۳۰" آپ کہیں گے "کس کو دئے جائیں اور کس طرح؟" وہ کہے گا "مجھے" آپ

کہیں گے "کب اور کہاں؟" وہ کہے گا: "ہوٹل میں ٹاٹ میں۔ رات کو ۹ بجے" آپ کہیں گے "اچھا۔ شکریہ" — اور رات کو ۹ بجے جب آپ ہوٹل میں اس سے ملیں گے تو وہ کہے گا۔ "آئیے آئیے — چائے پیجئے" اور وہ آپ کے لئے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے کہے گا: "میری چیز لائیے" آپ کہیں گے "ہاں" وہ کہے گا "اس اخبار کے نیچے رکھ دیجئے" آپ اس کے حکم کی تعمیل کرینگے۔ وہ اخبار معہ روپیہ کے اپنی جیب میں رکھ کر کہے گا۔ "دیکھئے۔ میں نے آپ کے لئے ایک سارٹیفکٹ حاصل کر لیا ہے جو تقریباً D.C. کے برابر ہے" آپ حیران ہو کر کہیں گے۔ "تقریباً D.C. کے برابر؟" وہ کہے گا "جیسا کہ میں آپکو بتا چکا ہوں D.C. بغیر پولیس انکوائری کے نہیں دیا جا سکتا اسی لئے میں نے ایک انجمن مہاجرین سے ایک میوحی سارٹیفکٹ حاصل کر لیا ہے جسے ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ سے Attest کروا لیجئے" اور یہ کہکر وہ آپ کے سامنے سارٹیفکٹ رکھ دیگا۔ آپ اس سارٹیفکٹ کو غور سے دیکھیں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ "ریڈی میڈ" (Ready Made) سارٹیفکٹ ہر شخص کے لئے استعمال ہو سکتا ہے، جسکا بھی نام اس پر لکھ دیا جائے۔ وہ کہے گا: "اپنا نام اور ولدیت بتائیے" آپ اسے اپنا نام اور ولدیت بتا دیں گے۔ وہ آپ کا نام اور والد کا نام سارٹیفکٹ کی خالی جگہ میں لکھ کر کہے گا۔ "یہ آپ کے بسنے اور پرانے یعنی Settled رفیوجی ہونے کا ثبوت ہے۔" آپ کہیں گے "کیا یہ چل جائیگا — مان لیا جائیگا؟" وہ کہے گا "کیوں نہیں؟" ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کے Attest کر دینے کے بعد کون ہے جو اس پر شک کر سکتا ہے؟" آپ پھر کہیں گے "کیا دفتر والے مان۔" وہ کہے گا "ان کے باپ کو بھی ماننا پڑیگا اگر نہیں مانیں گے تو میں آپکے روپئے واپس کر دوں گا" آپ کہیں گے۔ "تب تو ٹھیک ہے۔ مگر فرسٹ کلاس مجسٹریٹ . . ." وہ کہے گا "ہاں کسی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ سے Attest کروا لیجئے اسے" آپ کہیں گے "میں تو کسی کو نہیں جانتا" وہ آپکی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہیگا "تو آپ چاہتے ہیں کہ یہ کام بھی میں ہی کر دوں؟" آپ کہیں گے "اگر آپ اسے کرا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی" وہ رک کر کہے گا "تو پھر دس . . ." آپ کہیں گے "اس وقت تو نہیں ہے جب آپ کرا دینگے تو —" وہ کہے گا "اچھا۔ کل یہاں پھر ملئے" — اور دوسرے دن آپ مبلغ دس روپے دیکر Attested سارٹیفکٹ حاصل کر کے اطمینان کی سانس لیں گے اور اپنے تقرر کے خط کی راہ تکنے لگیں گے۔

ایک ہفتہ "بعد" آپ کو تقرر کا خط ملے گا۔ آپ اسے جادو کا کرشمہ سمجھیں گے اور یقین نہیں کرینگے کہ یہ واقعی آپ کے نام ہے بہرحال آپ اس خط کو لے کر دفتر پہنچیں گے اور اپنے رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست کو دکھائیں گے اور دکھا کر اسے اپنی جیب میں رکھ لیں گے۔ وہ مسکرا کر کہے گا "مبارک ہو" آپ پوچھیں گے "کیا یہ ٹھیک ہے؟" وہ بولے گا "بالکل ٹھیک" آپ کہیں گے "آپ مذاق کر رہے ہیں" وہ کہے گا "مذاق نہیں چلئے آپکو Estate کلرک کے پاس لے چلوں"۔ اور پھر آپ کا تعارف Estate کلرک سے ہوگا، جو آپ کو ہیڈ کلرک کے پاس لے جائیگا اور ہیڈ کلرک آپکو آفیسر سپروائزر (O.S.) کے پاس۔ O.S. ہیڈ کلرک سے کہے گا "انہیں کرانی کی جگہ لگا دیجئے" اور آپ D.O. وغیرہ کی چند رسموں سے فارغ ہو کر کرانی کی سیٹ پر آ کر بیٹھ جائینگے۔ اب آپ کو کچھ کچھ اپنے تقرر کا یقین ہونے لگے گا — آپ کو بیٹھے ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ کہ ہیڈ کلرک آپکو اپنے پاس بلا کر کہے گا "ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ نیا آدمی اسٹاف کو چائے پلاتا ہے" آپ کہیں گے "میں خوشی سے پلانے کے لئے تیار ہوں لیکن —" وہ کہے گا "پیسے کی فکر نہ کیجئے۔ کینٹین میں اکاؤنٹ کھل جائے گا" آپ کہیں گے "تو پھر ابھی منگوا لیجئے — اور نہ صرف چائے بلکہ کیک، پیسٹری وغیرہ بھی" وہ ہنسنے لگے گا اور ہنستے ہوئے کہے گا "آپ بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں" آپ مسکرا کر کچھ جھینپتے ہوئے کہیں گے "جی کبھی تھا" وہ آپ کے اس جواب سے خوش ہو کر پوچھے گا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" آپ جواب دیں گے "کانپور کا لیکن اب تو —" وہ کہے گا "اخاہ کانپور۔ آپ خان بہادر سکندر علی خاں سے واقف ہیں جن کے چمڑے کے کئی کارخانے ہیں"

آپ سوچیں گے کون سکندر علی خاں؟ لیکن کہیں گے "جی ہاں" وہ بولے گا "وہ میرے چچا کے سالے کے سالے ہیں۔" آپ اسے حیرت سے دیکھیں گے۔ وہ پھر کہے گا "میرے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ دراصل میری شادی ان کی بہن سے طے ہوئی تھی لیکن میں ایک دوسری لڑکی یعنی نواب زادی یعنی نواب حیرت علی لکھنوی کی چھوٹی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگیا اور شادی کا معاملہ غتربود ہوگیا۔ اب بھی ان سے خط و کتابت رہتی ہے۔ ابھی کل ہی ان کا خط آیا تھا، جس میں انہوں نے اپنی بہن کی بُری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور درخواست کی ہے کہ میں آکر اُسے دیکھ جاؤں۔ آپ سمجھتے ہیں اسکا کیا مطلب ہے؟ یہی کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ میرے پاس ایک قانونی بیوی موجود ہے اور درجنوں غیر قانونی ——" آپ اس تقریر کو دلچسپی سے سُنیں گے اور پھر کہیں گے "آپکی کل کتنی بیویاں ہیں؟" وہ اس سوال سے جوش میں آکر کہے گا "اسوقت تعداد چالیس ہے" آپ کہیں گے "ماشاءاللہ چشم بد دور"۔ وہ خوشی سے پھول جائیگا اور اپنی کرسی سے اُٹھکر آپکے سامنے کھڑا ہو جائیگا اور آپ کے شانوں کو دباتے ہوئے کہے گا "یہ چالیس تو صرف وہ ہیں جن سے میں مستقل وابستہ ہوں — ورنہ انکی تعداد اتنی ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا۔"

آپ کہیں گے "آپ تو واجد علی شاہ معلوم ہوتے ہیں" وہ خوشی سے تقریباً پاگل ہوکر کہے گا "کرامت جاؤ کینٹین سے چائے لے آؤ — دو آدمیوں کے لئے" اور پھر آپ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہے گا "یہ چائے میری طرف سے ہے آپ کی آمد کی خوشی میں" آپ کہیں گے "مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہے اور اس چائے کے بعد میری چائے ——" وہ کہے گا "ہاں ہاں وہ بھی پیوں گا — لیکن آپ یہ بتائیے کہ آپ میری عمر کا کیا اندازہ کرتے ہیں؟" آپ کہیں گے "زیادہ سے زیادہ تیس برس" وہ ایک بار پھر آپ کے کندھوں کو دبا کر فخریہ کہے گا "میری عمر اسوقت ۴۵ سال ہے" آپ تعجب سے کہیں گے "اچھا؟ لیکن دیکھنے میں تو آپ ......" وہ بات کاٹ کر کہے گا "میری جوانی کا راز یہ ہے کہ میں سانپ کا ڈسا ہوا ہوں" آپ کہیں گے "سانپ کا ڈسا ہوا؟" وہ کہے گا "جی ہاں — میں بچ گیا — یہ واقعہ مصر کا ہے جبکہ میں وہاں انڈین ایمبسی (Embassy.) میں فرسٹ سکریٹری لگا ہوا تھا۔ مصر میں بھی میری ایک بیوی موجود ہے جس سے تین بچے ہوئے تھے۔ میرا مطلب ہے قانونی بیوی — ورنہ غیر قانونی بیویوں کے بچوں کی تعداد مجھے نہیں معلوم —— ہاں تو مصر کے ایک ریگستانی علاقہ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں ایک بہت بڑے اژدہے کو میں نے پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے اُسے فوراً اپنے ریوالور کا نشانہ بنالیا۔ لیکن اژدہا، اژدہا تھا۔ وہ تڑپ کر میرے قریب آیا اور آکر اس نے میرے پیر میں ڈس لیا۔ میں بیہوش ہوگیا۔ اور جب ہوش میں آیا تو دیکھا، میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے پلنگ کے پاس ایک مصری نازنین کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت ہوگیا اور میں نے انگریزی میں پوچھا "میں کہاں ہوں"۔ مصری نازنین نے جواب دیا "دوست کے گھر میں — مگر آپ بولئے نہیں" میں چپ ہوگیا۔ میں نے اشارہ سے پوچھا "میں یہاں کیسے آیا؟" مصری نازنین نے بتایا "میں نے آپکو اژدہے کا شکار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپکی بہادری سے متاثر ہوکر میں آپکو یہاں اُٹھا لائی۔ گھبرایئے نہیں آپ اچھے ہو جائینگے۔ کیونکہ میں نے سانپ کا زہر چوس کر تھوک دیا ہے" میں اس انکشاف سے دنگ رہ گیا۔ اور جب کئی دن بعد اچھا ہوا تو اس کو ایسا صدمہ دیا کہ وہ بھی یاد کرتی ہوگی ——" اس عرصہ میں کرامت چائے لاکر رکھ دیگا اور آپ چائے کا ایک گھونٹ لیکر کہیں گے "خوب — جبھی تو آپ میں اتنی قوت نظر آتی ہے" وہ ہنسکر بولے گا "آپ مذاق کرتے ہیں" آپ کہیں گے "نہیں سچ کہہ رہا ہوں" —— اچانک وہ اندر بلالیا جائیگا اور آپ چائے پی کر اپنی کرسی پر جاکے بیٹھ جائیں گے — جب وہ لوٹ کر آئیگا تو آپکو پھر بلائیگا اور پوچھے گا "آپ کس یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں؟" آپ کہیں گے "الہ آباد یونیورسٹی" وہ اُچھل پڑیگا اور کہیگا "میں بھی وہیں کا گریجوٹ ہوں۔ کیا آپ نوازش کو جانتے ہیں جو کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا؟ آپ کھوٹ موٹ کہدینگے "ہاں" وہ بولے گا "اور چندر موہن کو جو یونین کا سیکریٹری تھا؟" آپ پھر کہیں گے "ہاں" وہ اور گرما کر کہیگا "آپ جانتے ہیں یہ دونوں میرے کلاس فیلو تھے اور میری بڑی عزت کرتے تھے کیونکہ درحقیقت میں ان کا استاد تھا۔ میں نے نوازش کو کرکٹ کھیلنا سکھایا تھا اور چندر موہن کو یونین کا سکریٹری

بنوایا تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے بڑی زبردست جنگ لڑنی پڑی تھی اپوزیشن کے چند غنڈے میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور میری جان خطرہ میں تھی۔ راستہ چلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور تن تنہا آیا جایا کرتا تھا۔۔۔ ایک دن میں یونیورسٹی کے بھاٹک پر کھڑا مس نسیمہ صادق سے گفتگو کر رہا تھا۔ یہ بھی میری کلاس فیلو تھی۔ اور مجھ پر عاشق تھی۔ ہاں تو میں باتیں کر رہا تھا کہ اچانک یہ غنڈے لاٹھیاں لیکر مجھ پر ٹوٹ پڑے ۔۔۔ آپ جانتے ہیں میں جوڈو کا ماہر ہوں۔ میں نے ایک رومال سے ان سب کی لاٹھیاں چھین لیں غنڈے میرے قدموں پر گر پڑے اور گڑگڑا کر انہوں نے معافی مانگی اور کہا "آج سے آپ ہمارے استاد ہیں اور ہم آپکے اشارہ پر جان دینے کے لئے تیار ہیں۔ میں نے غنڈوں کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور کہا "دیکھو۔ چندر موہن کو سکریٹری بنوانا ہے۔ جو شخص مخالفت کرے اس کی مرمت کر دو۔" غنڈوں نے کہا "استاد ایسا ہی ہوگا۔" اور چندر موہن سکریٹری ہو گیا ۔۔۔ "آپ استاد کے پتلے دُبلے جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہیں گے "اچھا۔ جبھی تو میں سوچ رہا تھا کہ آپ کا جسم پہلوانوں جیسا لگتا ہے۔" وہ یکبارگی اپنی آستینیں اوپر چڑھا کر اپنے دائیں ہاتھ سے ساعت کی شکل بناتے ہوئے کہیگا۔ "دیکھئے۔ میرے پٹھے آج بھی سخت ہیں۔ فولاد کی طرح" وہ آپکا ہاتھ پکڑ کر اپنے پٹھے پر رکھتے ہوئے پوچھے گا "سخت ہے نا؟" آپ کہیں گے "بالکل فولاد کی طرح" وہ کہے گا "ذرا دیکھئے۔ یہ نشان خنجر کا ہے۔" آپ کہیں گے "خنجر کا؟" وہ اکڑ کر کہے گا "جی۔ خنجر کا۔ آپ جانتے ہیں یہ خنجر ایک لڑکی نے مارا تھا جس کا نام تبری تھا۔ میری ایک بڑی مغرور لڑکی تھی اور میری کلاس فیلو بھی تھی۔ ایک دن میں نے اس کی دعوت کی اور اس دعوت میں اظہار محبت کر دیا ۔۔۔ وہ چراغ پا ہو گئی اور اس نے اپنی جیب سے خنجر نکال کر مجھ پر وار کر دیا۔ میں نے اس وار کو اپنے فولادی پٹھے پر لیا اور بائیں ہاتھ سے اسکا خنجر چھین لیا۔ اور خنجر چھپا کر میں نے اس سے کہا "بتاؤ۔ اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟" تو وہ بولی

"I am entirely in your hands" میں نے کہا "Darling, you are free." وہ اس محبت آمیز سلوک سے اتنی متأثر ہوئی کہ رو کر کہنے لگی۔

میں نے کہا "Pardon, Pardon." اس نے سر "will you be mine?" ہلا کر کہا "Yes - Yes - Yes." اور پھر آپ جانتے ہیں ۔۔۔۔" اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجے گی۔ اور وہ "ہیلو۔ ہیلو" کرنے لگے گا اور آپ اٹھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جائینگے۔

آپ سیٹ پر بیٹھ جائیں گے اور ہیڈ کلرک اپنی ٹوپی وغیرہ پہن کر باہر چلا جائیگا۔ اب آپ کلرک بھائیوں کے درمیان ہوں گے اور یوں محسوس کرینگے جیسے کوئی جنگلی جانور پالتو جانوروں کے بیچ میں آگیا ہو۔ پالتو جانور آپکی طرف گھور گھور کر دیکھیں گے اور مسکرائیں گے اور آپ بھی انکی طرف دیکھیں گے اور مسکرائیں گے۔ آخر کار ان میں سے ایک اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر۔ ذرا اس ڈرافٹ کی نقل کر دیجئے" آپ نقل کر دیں گے۔ پھر دوسرا اُٹھے گا اور کہے گا "مسٹر۔ ذرا آپ اسکا فائل کو ربدل دیں" آپ فائل کو ربدل دیں گے۔ پھر تیسرا اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر۔ ذرا یہ ٹوٹل کر دیجئے" آپ ٹوٹل کر دیں گے۔ پھر چوتھا اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر۔ ذرا آپ اسے فلیگ کر دیں" آپ فلیگ کر دینگے۔ پھر پانچواں اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر ذرا آپ اسکی پیجنگ کر دیں" آپ پیجنگ کر دیں گے۔ غرضکہ باری باری ہر کلرک اپنے کام کا کچھ حصہ کرنے کو دیگا اور آپ اسے خندہ پیشانی سے کر دینگے۔ کیونکہ آپکو بہرحال کام سیکھنا یا سمجھنا ہے۔ اور جب آپ کام سیکھ یا سمجھ لیں گے تو پھر ظاہر ہے کہ آپ ان کلرکوں کو "ٹھینگے" پر ماریں گے۔ اور آپ زیادہ چالاک ہوں گے تو پھر اُلٹا اُنہیں سے کام لینا شروع کر دینگے۔

دفعتاً آپکو D.S. بلا بھیجے گا۔ آپ وہاں پہنچکر دیکھیں گے کہ Estab کلرک کھڑا ہوا ہے۔ D.S. آپکو اور اس کلرک کو ساتھ لیکر "صاحب" کے کمرہ میں داخل ہوگا۔ D.S. صاحب سے کہیگا "یہ ہے وہ آدمی جو آج آیا ہے" صاحب پوچھے گا "تمہارا appointment کیسے ہوا؟" آپ کہیں گے "خط کے ذریعہ" وہ پوچھے گا "خط کہاں ہے" آپ کہیں گے "میرے پاس ہے" وہ حکم دیگا "خط پیش کرو" آپ جیب سے خط نکالکر پیش کر دیں گے۔ وہ اسے بغور دیکھ کر کہے گا "دستخط تو میری ہی معلوم ہوتی ہے" D.S. کہیگا "یقیناً آپ ہی کی ہے" وہ کہیگا "میں نے اس پر دستخط کیسے کیا؟" Estab کلرک کہیگا

"آپ نے اسپر اسلئے دستخط کیا کہ آپ نے اس آدمی کو
کیا تھا" صاحب چیخ کر کہے گا۔" میں نے اسے کب سلیکٹ
کیا تھا؟ میں نے تو ڈپٹی صاحب (ڈپٹی سکریٹری) کے آدمی کو
سلیکٹ کیا تھا۔ اب میں انہیں کیا جواب دوں۔ بولو کیا
جواب دوں؟" وہ غصہ سے میز بجانے لگے گا اور آپ کے تقرر کا خط
پھینک دے گا جسے آپ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیں گے پھر
Estab. کلرک آپکی سرکاری فائل اس کے سامنے رکھ کر کہے گا۔
"دیکھئے۔ آپ نے اسے ۱۰۰ میں سے ۹۰ نمبر دئے ہیں یعنی سب
سے زیادہ مارکس (Marks) جنرل نالج میں 50۔ انگلش اسپیکنگ
پاور میں 20۔ پرسنالٹی میں 15۔ اور ہینڈ رائٹنگ (جسکا اندازہ
درخواست سے بخوبی کیا جا سکتا تھا) میں 5 — اور پھر آپکا یہ ریمارک
کہ یہ شخص Above Average ہے۔" صاحب
ان نمبروں کو غور سے دیکھے گا اور اس ریمارک کو بھی اسے اپنی آنکھوں
پر یقین نہیں آئیگا اور وہ کہیگا۔" ڈپٹی صاحب کے آدمی کے مارکس
کتنے ہیں؟" Estab. کلرک فوراً ایک کاغذ نکال کر پیش
کرتے ہوئے کہیگا۔ "دیکھئے۔ جنرل نالج میں ۵۔ انگلش اسپیکنگ
پاور میں ۵۔ پرسنالٹی میں ۱۔ اور ہینڈ رائٹنگ میں 5۔ کوئی
ریمارک نہیں" O.S کہے گا۔" ریمارک کی ضرورت ہی نہیں۔ صاحب
سناٹے میں آجائیگا اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہے گا۔" بولو اب میں کیا
کروں؟ ڈپٹی صاحب کو کیا جواب دوں؟ ان کا ٹیلیفون پر ٹیلیفون
چلا آرہا ہے۔ O.S. کہیگا "آپ اُن سے کہدیں کہ next
Vacancy میں ان کے آدمی کو لے لیا جائیگا۔" وہ کہے گا۔
"ڈپٹی صاحب ناراض ہو جائیں گے۔" Estab. کلرک کہیگا
"آپ ان سے کہدیں کہ بڑے صاحب نے اس آدمی کو لینے کا
زبانی حکم دیا تھا اور چونکہ جگہیں تین تھیں۔ اس لئے ایک آنریبل
منسٹر کا آدمی۔ ایک سیکریٹری صاحب کا آدمی اور ایک بڑے صاحب
کا آدمی لے لیا گیا۔" صاحب اس جواب سے خوش ہو کر کہے گا۔
"بائی گاڈ۔ یہ مجھے کبھی نہ سوجھتی۔ اچھا ہے سارا وبال بڑے
صاحب کے سر پر ہوگا — چپراسی"۔ وہ گھنٹی بجا کر کہے گا۔ "چائے لاؤ"۔
اور آپ معہ O.S. اور Estab. کلرک کے کمرے سے باہر ہونگے
اور جب O.S. اپنے کمرہ میں چلا جائیگا تو آپ Estab.
کلرک کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر کہیں گے۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے
دماغ کا بوسہ لے لوں"۔ وہ مسکرا کر کہیگا۔ "یہ تو بہت معمولی سی بات
تھی۔ اس سے بڑے بڑے معاملات چٹکی بجاتے طے ہو جاتے ہیں"۔
آپ اسکی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہیں گے۔ "مجھے
یقین ہے آپ اسکی اہلیت رکھتے ہیں" — اور پھر آپ Estab.
کلرک کا ساتھ چھوڑ کر اپنے رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست
سے ملیں گے اور اسے یہ داستان سنا کر پوچھیں گے۔ "بھئی وہ جو
میں نے آپکو روپئے دئے تھے نا۔ اس میں سے پچاس تو Estab.
کلرک نے لئے ہوں گے۔ باقی کس نے لئے؟" وہ کہے گا۔ "یہ صیغۂ راز
میں ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "اب ایسا بھی پردہ کیا؟ میں کسی سے
کہنے تھوڑے چلا جاؤں گا۔ اور پھر اگر کسی سے کہوں گا بھی تو وہ مجھ
پر یقین کب کریگا؟" وہ سوچ کر کہیگا۔ "اچھا سنئے پچاس روپئے
Estab. کلرک نے لئے۔ پچاس ہیڈ کلرک نے اور پچاس میں نے
مجھے روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ میری بیوی بیمار ہے اور بچے بھی اور
—" آپ فوراً کہیں گے۔ "کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔
آپ نے لیا، اچھا کیا، مجھے خوشی ہے کہ میرا روپیہ آپکے کام آیا — ہاں
تو پچاس ہیڈ کلرک نے بھی لئے؟" وہ کہے گا۔ "ہاں۔ اس
کے بغیر آپ کا تقرر نہیں ہو سکتا تھا"۔ اور پھر بات بدل کر کہیگا
"آپ نے ناشتہ واشتہ کیا یا نہیں؟ — نہ کیا ہو تو چلئے
میرے ساتھ کینٹین"۔ آپ کہیں گے۔ "بھئی میں نے ناشتہ
کر لیا ہے اور تھوڑی دیر قبل چائے بھی پی لی ہے —
لیکن چلئے کینٹین میں میرا اکاؤنٹ کھلوا دیجئے"۔ اور
آپ اس کے ساتھ کینٹین پہنچ جائیں گے۔

(باقی آئندہ)

مداری

افضال اللہ

ڈگ۔ ڈگ۔ ڈگ!! ــــ ڈگڈگی بج رہی تھی۔ "ایک۔ دو۔ تین" بس اب کام شروع۔" نوجوان مداری کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو مضبوط رسّی سے اچھی طرح جکڑ لیا تھا اور برابر گر ہیں لگاتا چلا جا رہا تھا۔ دو آدمی رسّی کے دونوں سرے تھامے ہوئے تھے۔ تماشائیوں کا ٹھٹھ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ پچھلی قطار کے لوگ ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر جھک رہے تھے۔ آگے کھڑے ہوئے لوگ باوجود متعدد آوازوں اور درخواستوں کے کھڑے رہنے پر مصر تھے۔

"یا اُستاد!" مداری ایک کرخت لہجہ میں چیخا۔ "نکل جاؤں اس پھندے سے بغیر کھولے ہوئے! ضرور نکل جاؤں گا!! کس کے رو منا" دونوں آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے۔ "ارے یار ذرا کھینچ کر دم گھونٹ دو گے"

مداری کا سارا جسم بُری طرح جکڑ گیا تھا اور تماشائی متحیر تھے کچھ لوگوں کے دلوں میں جذبۂ ترحم جاگ اُٹھا تھا۔ وہ بالکل بے بس اور مظلوم معلوم ہو رہا تھا حالانکہ اس نے خود ایسا کیا تھا۔ لوگ بکبو نی اور شوق کے ساتھ اس کھیل کو دیکھ رہے تھے اور بڑی ہی بےچینی کے ساتھ نتیجہ کے منتظر تھے۔

مداری نے بیسیوں دفعہ "نکل جاؤں" کہا ہوگا۔ لیکن ایک بار بھی نہ نکلا اور اسی شکل میں پورے مجمع کے سامنے چکر لگاتا رہا اور گا ٹھیں دکھاتا رہا کہ کہیں سے کھلنے یا کھولنے کی گنجائش تو نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد قبل اس کے کہ وہ اپنا پہلا اور آخری کرتب دکھائے۔ مجمع کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور تقریر کرنے لگا

"ہندو بھائی کو رام کی قسم اور مسلمان کو خدا کی اگر وہ بغیر تماشہ دیکھے چلے جائیں اور جیب میں کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک پیسہ نہ دیں۔ دیکھئے بھائیو! آپ سب لوگ دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور اس جگہ بھی کسی نہ کسی کام سے آئے ہوئے ہیں یہ سب کس لئے؟"

"پیٹ کے لئے" (ملی جلی آوازیں)

"ہاں پیٹ کے لئے۔ ایسے ہی یہ مداری جو آپ کے سامنے کھڑا ہے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر آپ کو تماشہ دکھا رہا ہے۔ یہ سب کس لئے؟ پیٹ کے لئے۔ ہائے رے پیٹ!!

ہے کوئی مائی کا لال جو روپیہ آٹھ آنہ چار آنہ اس بھگوان۔ اس خدا کے نام پر مداری کے . . . .

اچھا اب دیکھئے گھبرائیے نہیں آپکو یہ تماشہ دیکھنا ہے۔ اور اب یہ کام شروع۔ ایک۔ دو۔ اور پھر دو ایک کام اور دیکھنے ہیں۔ اچھا دیتے جائیے"

مداری کہتا رہا اور چاروں طرف گھومتا رہا اور یہ یقین دلاتا رہا کہ وہ پھندے سے نکلنے کا کرتب دکھلانے ہی والا ہے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ متجسس ہوتے گئے۔ مداری کی پُرسوز تقریر کا اثر یہ ہوا کہ ایک پیسوں کا تھا سا ڈھیر اسکی چادر پر لگ گیا۔ اب تک لوگ کافی انتظار کر چکے تھے اور جلد سے جلد اس کرتب کا نتیجہ دیکھنا چاہتے تھے۔ مداری کرتبوں کے نام گنتا رہا اور اسی دوران میں اس نے ایک گولا اپنے جھولے سے غائب کرکے اور پھر اوپر ہاتھ کرکے واپس بلا لیا۔ اور یہ بھی کہا کہ اسی طرح میں بھی اوپر اُڑ سکتا ہوں۔ دیکھتے جائیے کافی دیر ہو جانے کی وجہ سے اکثر تماشائی اپنے اپنے کام کو روانہ ہو گئے

مداری نے پھر کہا۔ "ابھی دکھاتا ہوں"

دیکھتے دیکھتے میدان صاف ہو گیا اور سب لوگ چلے گئے مداری پیسے سمیٹ کر جھولی میں رکھ کے جانے لگا۔

جمال اس طلسمی ماحول کا جیسے ایک فرد ہو اسے یہ احساس بالکل نہ ہوا کہ وہ سڑک کے کنارے اور اجنبی مداری کے قریب اب تک کھڑا، سگریٹ کے کش لگاتا چلا جا رہا تھا۔

"سرکار!"

اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ مداری پیسے مانگ رہا تھا۔ کتنا خوش گلو تھا اس کا وہ لہجہ اور کیسا عجز تھا۔ اس کے انداز میں۔ اسنے بالکل غیر ارادی طور پر اسکے ہاتھ پر وہ اکنی رکھدی جسے وہ پینٹ کی جیب میں جانے کتنی دیر سے توڑ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا،

اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں کچھ جلتی محسوس ہوئیں اسوقت جاکے اسے خیال آیا کہ سگریٹ کا آخری سرا بھی جل جانے کو ہے۔ اس نے جلدی سے جلتی ہوئی سگریٹ پھینکی اور اپنی کوتاہ اندیشی پر افسوس کرتا ہوا ایکطرف کو چلدیا۔ آدھی سگریٹ سے ابھی کتنا وقت گزارنا تھا لیکن وہ موقع ہی نکل چکا تھا

مراری اور کشور سائیکلوں پر کستے دکھائی دیئے اور ایک پھیکے انداز میں انہوں نے سلام کا جواب دیا اور گذر گئے۔ اس کے چار سال کے ساتھی اور دوست اب سے چند ماہ قبل دفتر کی ملازمت میں بھی ساتھ تھے اور کیسے ہی رزق رساں شہروں کے سفر میں بھی۔ لیکن آج وہ مخالف سمت میں جارہے تھے اپنے دفتر لیکن چند دنوں اگر نہیں مہینوں کے بعد بھی وہ بھی ان کے ساتھ ہوگا آخر حامد اور سیشل بھی تو آٹھ نو مہینے تک سرگرداں رہے اور پھر انہیں مرکزی دفتر میں جگہ مل ہی گئی۔ لیکن انہوں نے دو دو سو روپئے کوشش و پیروی میں صرف کئے تھے۔

دو سو روپئے! ایک عظیم سدراہ، ایک بلند فصیل کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

وہ چلتے چلتے سڑک کے کنارے رک گیا اور ایک سوکھا پتا اٹھاتے وقت چیونٹیوں کی ان گنت تعداد پر نظر دوڑانے لگا۔ یہ ننھی سی روحیں کتنی جفاکش اور مستقل مزاج ہیں اس کے ذہن کے پردے پر لاتعداد اقوال، مثالیں اور قصے امیدوں کے کنول بنکر چھا گئے۔

اس نے اپنے غیر شعوری سفر کو دفتر ملازمت کی طرف موڑ دیا اب وہ سنسان اور چکنی سڑک پر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اور اس کے خیالات کے شہپر فضا میں پرواز کر رہے تھے آج بھی اس ساتھ کے امیدواروں کا نام نکلنے والا تھا۔ پہنچتے ہی اس نے فہرست پر نظر دوڑائی۔ فلپس، گوبند سنگھ، بھیکو داس، سرنیدر پرتاپ سنگھ۔

ایک طویل فہرست تھی اس نے دوبارہ غور سے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جمال جیسا نام ضرور نظر پڑا تھا۔ یکایک اس کی نظریں رکیں اور شکستہ حروف پر غور کیا صاف جمال لال اہوجا لکھا ہوا تھا

ایک یاس انگیز جمائی لے کر وہ پاس کی بینچ پر گر گیا۔

کالج چھوڑے ہوئے اب قریب ایک سال سے کچھ زائد ہی ہورہے تھے۔ زندگی کا ایک سال جو کبھی بہت قیمتی ہوا کرتا ہے وہ وقت جو ایک قوم و ملک کی زندگی اور موت کا ضامن ہوتا ہے۔ زندگی؟ ہاں وہی بیش بہا زندگی جو اس دنیا میں صرف ایک بار نصیب ہوتی ہے پھر وہ بھی جوان زندگی۔ اس مدت میں تو ایک عرصہ تک بھٹکتی ہوئی زندگی جو شاہراہ کو چھوڑ کر خارزاروں میں ماری پھرتی پھر سیدھی راہ پا سکتی ہے وہ راہ جو ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔ ہوا اور پانی کی طرح عام۔ یہ عرصہ اور وقت صرف سرکاری دفتروں کے طواف اور خداوندان مجازی کی آستاں بوسی میں صرف ہوگیا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب کے پھٹے ہوئے کناروں کو ہاتھ سے چھپانے کی کوشش کی اور بینچ سے اٹھ کر باہر لان پر ٹہلنے لگا۔ وہ زیر لب بڑبڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "آخر تین چار پتلونوں پر آدمی کب تک گزر کر سکتا ہے۔ گھڑی کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے وہ مستقل سُست جارہی ہے۔ اب تو کیچر جانا بھی بند ہوگیا ایک ہفتہ دو ہفتہ آخر مہینوں کیسے برداشت ہو اور اب تو مراری، کشور، حامد، اعظم، سرلا کوئی بھی تو نہیں ملتا۔ اور اکثر خود بھی ملنے کو جی نہیں چاہتا۔ جیسے سوسائٹی ہی ختم ہوگئی ہو۔ کل شب کو فلک پیما "میں حامد، کشور، اور کئی ملنے والے نظر آتے تھے۔ انہوں نے بڑی عجلت کے ساتھ سلام کا جواب دیا اور بغیر کچھ پوچھا بھی نہیں ہو سکتا ہے کسی مہمان کے ساتھ رہے ہوں۔"

وہ سوچتے سوچتے کچھ تھک سا گیا اور بار بار خواہش کے باوجود سگریٹ نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور جھلا گیا۔ "اُف یہ ظالم نظام!" یہ الفاظ کچھ زور سے نکل گئے۔

ساتھی ہریش جی منہ سے دھوئیں کا بادل نکالتے ہوئے کہہ رہے تھے اور قلیوں اور مزدوروں کی ایک بھیڑ سی جمع ہوگئی تھی۔ جمال بھی ان کے قریب کھڑا ہوگیا اس کی حریص نگاہیں بار بار سگریٹ پر جاکر جم جاتیں۔ ساتھی نے قینچی کی ڈبیہ نکال کر اس کے سامنے کردی۔ اس کی ایک مراد تو بر آئی۔

" ارے یہ سب دھوکا ہے ان کے پاس کام کہاں۔ ہر مل اور بڑے کارخانے

میں چھٹنی ہو رہی ہے۔ کھیت مزدور بیکار، ہنگروں کا کوئی دھندا نہیں اور روز بروز یہ بیکاری بڑھ رہی ہے۔ کام مانگنے سے نہیں ملتا ہے۔ لینے سے ملتا ہے۔ یہ لڑائی ہے لڑائی۔ روٹی کی لڑائی۔ اور آپ کو یہ لڑائی لینی ہے آج نہیں تو کل۔"

گھڑی پندرہ منٹ سست تھی پھر بھی ایک بجا رہی تھی۔ وہ قدم تیز تیز اٹھاتا ہوا مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ "کیا نام بدل دیا جائے آخر کشور اور مرلادی کو سروس مل گئی ہے کیا ہرج ہے لیکن سرٹیفکٹ کا کیا ہوگا۔ روٹی کی لڑائی۔ پیٹ کے لئے، کیا یہ ساری دُنیا انہیں کے گرد گھوم رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ لیکن اسے تو سگریٹ کی ضرورت تھی، پتلون کی، پکچر دیکھنے کی، ہاں سلمیٰ کے لئے آویزوں کی اس کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا۔ . . . . روٹی تو بُری بھلی مل رہی تھی۔"

یکایک اس کے ہوائی قلعے مسمار ہو گئے۔ اور مائیکروفون کی کرخت آواز اسکے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ "ساتھیو! آج شام کو مزدوروں کے جہان نیتا، محنت کشوں کے عظیم رہنما کی انقلابی تقریر ہوگی۔ اگر سماج کے مسائل کا حل اور ملک کی فلاح اور بہبودی کا فارمولا معلوم کرنا ہو تو بڑی سے بڑی تعداد میں گاندھی میدان میں تشریف لائیے۔"

لال جھنڈوں کے جلوس میں ایک نوجوان اعلان کر رہا تھا مگر چھوٹی موٹی تقریر کرتا جا رہا تھا۔

وہ تھا تھکا کر بستر پر آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا۔ اس کمرے سے جہاں کوئی جاذبیت نہ تھی اسے ایک عجیب اُنس ہو گیا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے کم سے کم ایک پناہ گاہ تھا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ آخر یہ کمرہ بھی کب چھوٹ جائے۔ کمرے کی دیواروں کی جا بجا اُکھڑی ہوئی سفیدی ایک افسردہ منظر پیش کرتی اور باہر کی متعفن فضا اس پر ایک اضافہ تھی۔ الماریوں کے کواڑ ادھ کھلے تھے اور میز پر کتابوں کا انبار سا ہو گیا تھا جس پر گرد کی ایک موٹی تہہ جم چکی تھی میز پوش جو شاید کبھی رنگین رہا ہو اب صرف مٹیالا تھا اس کا ایک گوشہ زمین سے بالکل قریب لٹک رہا تھا۔ کارنس پر رکھے ہوئے مجسموں کا رنگ اُڑ گیا تھا اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویریں جو کبھی ضرور سامان زینت تھیں مکھیوں کے بیٹھنے کی وجہ سے ایک مکروہ منظر پیش کر رہی تھیں۔

دن بھر کے ذہنی انتشار بلکہ ایک عرصہ کے مسلسل خلجان سے وہ ہر وقت ایک تکان سی محسوس کرتا۔ آج وہ خلاف معمول شام تک سوتا رہا۔ اُٹھنے کے بعد اس نے ہاتھ منہ دھویا اور اسے فوراً یاد آگیا کہ اسے چھ بجے تقریر سُننے جانا ہے جلدی جلدی کپڑے بدل اور ہلکا ناشتہ کرکے وہ روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بہت سے خیالات گھوم رہے تھے اور اس کے دل میں ایک نیا عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا تھا اسے اپنے اندر ایک باغی روح سرایت کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ "یہ غیر عادلانہ سیاسی نظام، یہ سماجی ڈھانچہ سب جبر و ظلم کی مختلف صورتیں ہیں اسکے وجود پر ایک زبردست انتقامی جذبہ طاری ہو گیا۔ اب وہ اپنا اگلا طلب و جستجو کا طریقہ یکسر بدل رہا تھا، اسے اس نظام کی ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی جہاں مداری کے شعبدے ہیں، مانگنے والوں کی بہتات ہے، فاقہ کشوں کی فراوانی ہے، اونچ نیچ ہے، آدمی آدمی کا ساتھی نہیں بلکہ دوسرے پر حکمرانی کے طریقے سوچتا ہے۔ . . ." اسکے ذہن میں یہ اور اس قسم کے بہت سے خیالات یک بیک آ گئے تھے۔ جیسے اس کے انتظار اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری باتیں آج ہی سوچ ڈالے گا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل بھی! اس جذب و خود فراموشی کے عالم میں وہ میدان میں پہنچ چکا تھا جہاں ابھی ابھی تقریر ہونے والی تھی۔ اس عظیم رہنما کی باتوں کی روشنی میں وہ اپنا اگلا پروگرام مرتب کرنے والا تھا جس کا ایک موہوم خاکہ اس کے ذہن میں تیار ہو گیا تھا۔ آج وہ اپنے میں غیر معمولی جوش و قوت محسوس کر رہا تھا۔

جے کاروں کے فلک شگاف شور سے عظیم رہنما کا استقبال کیا گیا۔ انقلاب زندہ باد اور دوسرے پر کشش نعروں سے مجمع پر ایک جوش و خروش کا عالم طاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سپاس نامے اور مدحیہ نظمیں پڑھی گئیں۔

"انقلاب زندہ باد۔"

"کامریڈ کی جے ہو۔"

اور تالیوں کی گونج میں لیڈر کی تقریر [illegible] ہو گیا۔ حکام کی بداعمالی اور عوام کی زبوں حالی کی داستان سُنائی گئی۔ اور ایک ایک کرکے عوام کی ساری تکالیف گنائی گئیں یہ سب کے

دل کی آواز تھی دلوں میں بیٹھ گئی اور مجمع مسحور ہو گیا خصوصاً لیڈر کی تقریر جو ایک دریا کے بہاؤ کی طرح تھی۔ موجودہ سیاسی نظام کے بخیوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا اور ساری مصلحت آمیز پالیسیوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا گیا۔ اس کا طرزِ بیان پُر اثر ہونے کے ساتھ ہی انتہائی مذاحیہ بھی تھا۔ حکام کی غلطی کا پردہ اس طرح فاش کیا کہ ایک دفعہ لاکھوں روپیہ صرف کر کے مچھلیوں کی تجارت کو فروغ دینے کے لئے اسکیم بنائی گئی۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تجربہ کی جانے والی مچھلیوں کو بڑی مچھلیوں نے کھا لیا اور اس طرح لاکھوں روپیہ مچھلیوں کی خوراک ہو گئے اور بس۔ ایک مثال یوں بیان کی کہ حکومت وقت اپنے عوام کی زندگیوں سے یوں کھیلتی ہے کہ دیہاتی اسپتالوں میں صرف دو یا تین رنگ کی دوائیں ہوتی ہیں جو سر کے درد سے لے کر مہلک سے مہلک امراض کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

سارے مجمع پر جیسے سحر ہو گیا ہو اور ایک عجیب خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ لیڈر تھوڑی دیر کے لئے رُکا۔ جمال کا سینہ ایک موہوم خوشی سے پھول گیا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ بیکاری اور غریبی کا حل ابھی پیش کیا جانے والا ہے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

لیڈر نے تمام سیاسی جماعتوں کے مقاصد کا جائزہ لیا۔ اور سب کی بنیادیں ہلا دیں۔

"مزدور ایکتا زندہ باد"

"جنتا کا راج ہو کے رہے گا"

نعروں کی گھن گرج میں لیڈر کی آواز کافی بلند ہو چکی تھی اور وہ ساری قوت صرف کر کے چیخ رہا تھا۔

"عوام کی بھلائی — عوام کی بہبودی اور صحیح معنوں میں جنتا کے راج کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ جو تمام دکھوں کا واحد علاج ہے — آگامی (آنے والے) چناؤ میں جنتا کی پارٹی کو ووٹ دیجئے۔ کامیاب بنائیے۔ پھر۔ پھر — دیکھئے۔

اس جملہ پر اسکی تقریر ختم ہو چکی تھی دوسرے ساتھی مختلف پروگراموں کا اعلان کر رہے تھے۔

جمال کے دل میں ایک عجیب خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کی تمام آرزؤں پر اوس سی پڑ رہی تھی۔ وہ ضرور ووٹ دیگا۔ لیکن اس کے سامنے مسائل تھے۔ ۔ ۔ ۔ اپنے اور دوسروں کے بھی —

اس سڑے ہوئے نظام سے اسے پھر نفرت ہوئی۔ اور اس کے ذہن میں بہت سے عظیم سیاسی رہنماؤں کے چہرے اُبھر آئے سب ہی سحر بیان ہیں، اُن کی آواز میں جادو ہے، انکی ذات میں کشش یا اور کچھ ہے جبھی تو اتنے بڑے بڑے اژدہام ہوتے ہیں، انسانوں کا سیلاب سا اُمنڈ پڑتا ہے۔ لیکن سب کے پاس ایک ہی مطالبہ ہے۔

آج اسکی سمجھ میں اس مداری کی پوری شخصیت آ گئی۔ جو شعبدے دکھاتا ہے اور شعبدوں کا وعدہ کرتا ہے۔ پیسے طلب کرتا ہے اور اسپر وہ مجبور ہے۔

اس کا ذہن تھک چکا تھا اور اس کی ساری اُمنگیں جیسے سرد پڑ گئی ہوں اور اس کی باغی روح جیسے نکل گئی ہو

"اُف یہ سماج — شعبدے اور پیسوں کی طلب۔ تقریریں اور ووٹ کی بھیک — سب مداری ہیں۔

چند غیر ارادی جملے کہتے ہوئے وہ خلا میں گھور رہا تھا۔

اقبال احمد انصاری

اپنی کہانی

مجھے کہانیاں لکھتے کئی سال ہو گئے ہیں۔ اسٹوڈنٹ، کلرک، طوائف، کسان، بیروزگار، عیاش سیٹھ، قلی . . . اور اپنے سماج کے سیکڑوں کرداروں کی کہانیاں لکھ چکا ہوں۔ آئینۂ تحریر میں ان کی اچھی تصویریں دکھلائی ہیں۔ ان پر تنقید کے نشتر چلائے ہیں، مرہم رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ مایوسوں کو آس کی کرن دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ . . یہ سب لکھ کر جب مجھے خوشی بھی ہوئی ہے کہ شاید کسی نے میرے نشتر کی ہمدردی کو محسوس کرتے ہوئے میرے مرہم کو قبول کر لیا ہو۔ شاید کسی نے مایوسیوں کی تاریکی میں آس کی کرن سے اجالا پائی ہو۔ کبھی اسی خوشی نے کوئی نئی کہانی لکھوا دی۔ کبھی کسی معمولی سے واقعہ نے اور کبھی کسی بڑے حادثے نے آمادہ کیا کہ کہانی لکھوں یا پھر کسی کی فرمائش نے مجبور کیا۔

بہر حال پورے چھ سات سال میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ مجھے کہانی لکھنے کو مل ہی گیا ہے۔ اور اب تک مجھے ادبی رسائل کے کثیر التعداد قارئین ایک مخصوص طرز اور مزاج رکھنے والے "کہانی گو" کی حیثیت سے جان چکے ہوں . . . یہی کہ میں کہانی لکھنے کا مطلب اپنے قریبی ماحول و سماج کے کسی کردار کی ہمدردانہ مگر تیز تنقید کرنا سمجھتا ہوں اسی تیزی کو لوگ نشتر لگانے سے منسوب کرتے ہیں لیکن میں اپنے خیال میں اندمالِ زخم کے لئے مرہم بھی بانٹتا رہتا ہوں۔ گویا کردار کی تنقیح میری آرزو ہے۔ اسی آرزو نے مجھ سے میرے آفس کے بڑے بابو، میری سوتیلی ماں، میرے دوست، میرے محلے کی لڑکیاں، میرے خاندان کے بھائی بہن . . . . اور ایسے ہی کتنے لوگوں پر کہانیاں لکھوائیں۔ البتہ ان میں آپ بیتی جگ بیتی کے روپ میں پیش کی گئی۔

میں کبھی کسی نوجوان کو ایک ہی راہ سے اکثر آتے جاتے دیکھتا ہوں اور اسے گاہ مغموم گاہ بشاش پاتا ہوں۔ پھر اسے اتفاقاً سینما ہال میں کسی حسین دوشیزہ کے ہمراہ دیکھ پاتا ہوں۔ اور کچھ دنوں بعد کسی دوست، ڈھنڈورچی یا اخبار سے سن پاتا ہوں کہ ایک نوجوان جوشِ رقابت میں قتل کر دیا گیا، اس کا گلا گھونٹ دیا گیا یا اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی تو میرے اندر جو "کہانی گو" ہے وہ ان تمام باتوں میں ایک غیر مرئی ربط پاتا ہے جسے عام لوگ محسوس نہ کر سکیں۔ لیکن وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور میں ایک نئی کہانی لکھتا ہوں۔

میں جب اس طوائف کے ہاں جاتا ہوں، جو میری نوجوانی میں تقریباً جوانی کی سرحد پار کر چکی تھی اور وہ مجھے اپنی نو عمر بچی کی نتھ اتارنے کی تقریب میں شرکت کے لئے دعوتی کارڈ دیتی ہے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر اس کارڈ کو بار بار پڑھتا ہوں جس کی سنہری تحریر سے کارڈ پر اس لڑکی کی تصویریں بننے لگتی ہیں۔ تو میں کارڈ رکھ کر سوچنے لگتا ہوں اور سوچتے سوچتے ایک کہانی تیار ہو جاتی ہے۔ جو رسائل میں شائع ہو جاتی ہے۔ اور جسے میں اس طوائف اور اس کی بیٹی کو بھی پڑھنے کو پیش کر دیتا ہوں۔

اور اس وقت بھی مجھے ایک یا کئی کہانیوں کے لئے خام مواد مل جاتا ہے جب میں اپنے قریبی ماحول میں کسی کمسنہ کو دوسری باشعور ہم صنف سے اختلاط بڑھاتے ہوئے اس سے کھلے چھپے شوق کی کیفیت کے ساتھ بار بار ملتے اور بہت سی طویل دوپہر ایک ساتھ گذارتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ پھر جلد ہی اس کمسنہ کے سینہ پر آثارِ جوانی غیر معمولی طریقے سے نمایاں ہونے لگتے ہیں ——— مجھے پس پردہ ایک کھیل نظر آتا ہے جو لطیف ترتیب پا کر کہانی بن جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میری مشہور کہانی "دھوبن" اس طرح تیار ہوئی تھی کہ میرے کپڑے دھونے والی دھوبن جیسی جوان تو نہ تھی لیکن اچھی صحت کی وجہ سے جوان ہی معلوم ہوتی تھی بالکل تنہا رہتی تھی۔ اس کا مکان یہاں نہ تھا۔ وہ یہاں آکر بس گئی تھی اور لوگوں سے خود کو بیوہ بتلاتی تھی۔ اپنے محلے کے علاقہ میں وہ بدنام بہت تھی۔ میرے ہاں تو وہ کبھی کپڑے لینے، کبھی دینے، کبھی دھلائی لینے اور کبھی ویسے ہی آیا کرتی۔ ایک بار میں بیمار پڑ گیا تو اس نے اپنی حد تک تیمارداری بھی کافی کی۔ ایک بار میں نے تقریباً اس سے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ

تو میں تم سے شادی کر لوں۔ میں اس کی بدنامی سے واقف تھا۔ سمجھتا تھا کہ اتنی شہ پاکر وہ کھل جائے گی لیکن اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کہنے لگی کہ آپ تو سنا ہے کہانیاں لکھتے ہیں۔ کہئے تو ایک کہانی میں بھی سنا دوں۔ جسے یہاں دوسرا کوئی نہیں جانتا تب اس نے اپنی گزشتہ زندگی کی وہ آپ بیتی سنائی۔ وہ کسی کریم کا اس پر عاشق ہو جانا۔ دونوں کا ملنا جلنا۔ کریم کا اسے بھگا لینا۔ بعد میں اسے مسلمان بنا کر اپنے گھر میں رکھنا۔ اس کا اپنی برادری سے ہمیشہ کے لئے خارج کر دیا جانا۔ پھر دو ہی سال گزرنے پر کریم کا اسے کہیں چھوڑ کر رفو چکر ہو جانا۔۔۔ یہی سب باتیں تو تھیں جو میری کہانی 'دلہن' کی اجزاء ترکیبی بنیں۔

یہ تو دو چار کا ذکر ہے ورنہ اس نگارخانۂ عالم میں ایسی باتوں کی کمی نہیں چشم بینا چاہئے۔ واقعات بہت ہیں۔ ہر زندگی جو دوسرے میدانوں میں حقیر و غیر اہم نظر آتی ہے اس کا ہر واقعہ کسی کہانی کا موضوع بن سکتا ہے لیکن میں نے اپنی افسانہ نگاری کی زندگی میں مشاہدات پر اکتفا نہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ ذاتی تجربات میں گہرائی، سچائی اور واقعیت و تاثیر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔۔

چنانچہ میری یہ دھن مجھے مکان اکثر آتی رہی۔ میں رات کے سیتر چھنے ساحل پہ گذارتا رہا۔ چھپا پانی اور ... مردوں کی دو عمر لڑکیوں کی تہہ اتارنے کی تقریب میں شامل ہوتا رہا۔ اپنے رشتہ کی بہنوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔۔۔۔ اور میرے نشتر و مرہم کا عمل جاری رہا۔ یعنی کہانیاں بنتی رہیں۔ رسائل میں شائع ہوتی رہیں اور مجھے داد و تحسین بھی ملتی رہی۔

لیکن زندگی کے اسی سلسلۂ واقعات میں ایک اہم واقعہ ایسا بھی ہے جس کی کوئی کہانی نہ لکھی جا سکی۔ اس کے لئے میں قلم نہ اٹھا سکا۔۔۔۔ وہ مارچ کی ایک پرسکون شام تھی۔ گاہے گاہے میں ہوٹل 'دی پیرس' میں جایا کرتا تھا۔ اس شام بھی وہیں پہنچ گیا تھا۔ تنہا ہی تھا۔ ایک طرف پردہ گرا کر بیٹھ گیا۔ کافی پی رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا کہ بغل کے پردے کے عقب سے کئی ملی جلی نسائی آوازیں آنے لگیں۔ میں کچھ زیادہ متوجہ ہو گیا۔۔۔ کسی موضوع پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ میں نے ذرا کرسی کا رخ اس طرح کر لیا کہ باتیں زیادہ صاف سنی جا سکیں ——

نسرین بھی تھی اور دو چار دوسری بھی۔ بات عارفی کے افسانوں پر ہو رہی تھی۔ دوسروں کا کیا ذکر نسرین تک کے میرے قلمی نام سے جاننے پر مجھے کچھ حیرت ہو رہی تھی۔ اپنے افسانوں پر تبصرہ زیادہ غور سے سننے لگا —— کوئی لڑکی کہہ رہی تھی "میں عارفی کو حقیقت نگار سمجھتی ہوں۔ وہ مکر و ریا سے کام نہیں لیتا بلکہ سماج کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ سماج جیسا کچھ ہے بعینہٖ اپنے آئینۂ تحریر میں اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ اس کا کیا دوش اکثر سماج میں ہی تعفن اور گندگی ہے۔۔۔ میں تو اسے بالواسطہ مصلحِ سماج سمجھتی ہوں۔ وہ مریضوں کو ان کے مرض پر چونکاتا ہے۔ گندگی کا نقشہ کھینچ کر گندگی سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔"

درمیان میں دوسری بولی "لیکن ضروری، غیر ضروری ہر بات کو کھول کر بیان کرتا ہے جس میں مرض اور گندگی سے نفرت کم اور رغبت و لذت کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔" پہلی لڑکی نے جواباً کہا "یہی تو حقیقت نگاری ہے۔ وہ پردہ پوشی نہیں کرتا۔ زخم کو ریشمی کپڑے سے ڈھک کر زخم کے وجود سے انکار کرنا نہیں سکھاتا۔"

پھر دوسری لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا "اچھا تو تم ہی بتاؤ کہ ہم میں سے کسی نے اس کے افسانے پڑھ کر اس کی گندگی سے نفرت کی ہے۔ کیا ہم سب ہی محظوظ ہونے، لذت لینے اور سب سے بڑھ کر صنفی میدان میں نئی باتوں کے انکشاف کی خواہش کے تحت اس کے افسانے نہیں پڑھتے؟ میں پوچھتی ہوں ہماری اپنی قریبی سوسائٹی میں عورتوں کی ہم جنسی قبیلت کے پرچار ہونے میں عارفی کا اہم حصہ تمہیں تسلیم ہے یا نہیں؟ مثالیں کیا پیش کروں تم خود ہی جانتی ہو۔ کیا یاد نہیں کہ تم نے میرے ہی ساتھ جب اس کا افسانہ "چادر" پڑھا تھا تو تم چونک گئی تھیں۔۔۔ اور جو تمہارے اندر ہر بات کا تجربہ کرنے کا خبط ہے۔ اسی خبط نے تمہیں کہاں پہنچا دیا۔۔۔ ان تلخ حقائق کو تم چاہو پردوں میں چاہو چھپاؤ۔۔۔ حقیقت پسندی کہو، سماج کی غیر جانبدارانہ عکاسی کہو یا۔۔۔" ریحانہ سے چپکے بیٹھا نہ رہا گیا۔ اس نے بھی دوسری لڑکی کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، میرے ایک دور کے بھائی ہیں وہ بھی عارفی کے بڑے مداح ہیں اور ہر روز کچھ نہ کچھ ایجادات کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے عشق کے میدان میں" پہلی لڑکی نے اس بار کچھ جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا "تم لوگوں کا زاویۂ نظر اور طرزِ فکر بالکل دقیانوسی ہے۔ جو کچھ ہو میں عارفی کو حقیقت پسند، سماج کا عکاس سمجھتی ہوں۔۔۔ اور اب اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

آخر میں نسرین کی باری آئی۔ اس نے ایک متانت بھری بیزاری کے ساتھ کہا "تم سب بکواس کرتی ہو۔ میں ادب میں لذتیت کی قائل ہوں۔ چاہے وہ سطح کی عریاں عکاسی کے ذریعہ ہو یا رومانی تخیلیت سے۔ میں عارفی کے افسانے پسند کرتی ہوں تو اسی لئے کہ اس میں تلذذ کے لئے وافر سامان ہوتا ہے۔ چاہے تم لوگ اسے سماج کی عکاسی یا اصلاح یا خدا معلوم کیا کیا کہو۔۔۔" گفتگو بہت طویل ہو چکی تھی اور تقریباً سب ہی اپنا اپنا خیال ظاہر کر چکی تھیں اس لئے جلد اختتام پذیر ہوئی۔ میں محویت کے عالم میں اپنے بارے میں سب کی رائیں سنتا رہا۔ یہ سب کچھ انکشافات کا درجہ رکھتے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان باتوں سے پہلے سے واقف تھا لیکن خود ہی کیلئے ان کی پردہ پوشی کر رکھی تھی۔

اور اب ان لڑکیوں نے اس پردہ کو اٹھایا بلکہ بڑی بری طرح قہقہے مار مار کر نوچ کھسوٹ ڈالا۔

ٹھنڈی کافی کے آخری بچے ہوئے گھونٹ حلق سے اتار کر لمبے قدم اٹھاتا ساحل کی طرف چل پڑا۔ ساری کی فضا سپیدی مائل سیاہی میں ملفوف ہو رہی تھی۔ پرسکون نرم ہوا چل رہی تھی۔ میں ساحل کے کنارے ریت پر لیٹ گیا۔ سارا گھنٹہ سر جھکائے رہا۔ نگو اس سے مل کر پہلے کی طرح خوشی نہ ہوئی۔ بلکہ دیکھ کر جھنجھلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ . . . . اس سے کیا کہتا۔

رخصت ہوتے وقت اس نے جو کچھ کہا جیسے زہر میں بجھے ہوئے تیر اتر گئے۔ شہاب اپنا اطلاع کرا دو دوست شاید۔ آئندہ میں تم سے مل سکوں گا۔

جب اپنے کمرے میں پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ میز پر لیمپ کے پاس ہی میرے ایک بے تکلف ایڈیٹر دوست کا خط رکھا تھا۔ مختصر سے خط میں خیر خیریت کے بعد لکھا تھا "سالنامہ کے لئے اپنی کہانی بھیجو"۔ . . . . . یعنی اپنی زندگی کی کہانی، میری آپ بیتی یا "اپنی کہانی" عام حالت میں اس جملہ کا سادہ مفہوم سمجھنا دشوار نہیں۔ لیکن اس وقت میں اس جملہ پر چونک گیا۔ وہ جملہ یا خود میرا ذہن ایک دوسرا مفہوم پیدا کر رہا تھا . . . . .

"میری اپنی کہانی"! ————

کیا میں بھی سماج کا ایک کردار ہوں جس کی تبلیغ کی ضرورت ہے؟

تعاون کی راہیں

۱۔ علم دوست اور ذی استعداد اصحاب کو "معیار" سے متعارف کرائیے۔

۲۔ اپنے یہاں کے اسکول، لائبریریوں، اور دیانت دار نیوز ایجنٹوں کے پتے ارسال فرمائیے۔

۳۔ ایسی فرموں کے پتے ارسال کیجئے جنہیں ہم اشتہار دینے کیلئے آمادہ کر سکیں۔

۴۔ اہلِ قلم حضرات دفتر کے تقاضوں کا انتظار کئے بغیر اپنی نگارشات ارسال فرمائیں۔

۵۔ اپنے مفید مشوروں سے بلا تامل مستفیض فرمائیں۔

۶۔ "معیار" کا نمائندہ جب آپ کے شہر یا قصبہ میں پہنچے تو اپنے وقت کا ایثار کر کے توسیع اشاعت کی کوششوں میں زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹائیں۔

ناظم ——— ادارہ
ماہنامہ "معیار" میرٹھ

خطوط و نکات

طیب عثمانی

"معیار" ادھر کچھ دنوں سے باقاعدہ دیکھ رہا ہوں، بڑی مسرت ہے کہ پابندیٔ وقت کے ساتھ آپ اسے شائع کر رہے ہیں عرصہ سے خیال تھا کہ "معیار" کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کروں لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کا موقع نہ مل سکا۔ الحمد آج یہ دلی خواہش آج شرمندۂ تکمیل ہو رہی ہے — جن نامساعد حالات میں آپ "معیار" نکال رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ "نئی نسلیں" کے سلسلہ میں مجھے اس کا خوب اندازہ ہے کہ اس دور میں کسی بامقصد، سنجیدہ، اور تعمیری رسالہ کا جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں۔ خدا کرے معیار جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔

"معیار" کی سب سے اہم خوبی میرے خیال میں اس کا تنوع ہے اور اسے باقی رہنا چاہئے ہاں "نقش اول" کے سلسلہ میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ادھر چند اشاعتوں سے مسلسل یہ دیکھ رہا ہوں کہ "نقش اول" میں مختلف موضوعات پر فلسفیانہ انداز کی چیزیں آرہی ہیں جو کچھ زیادہ مفید نہیں، اسلئے کہ فلسفیانہ اور فکری مباحث میں تفصیل و طوالت کی ضرورت ہوتی ہے، تب بات واضح ہوتی ہے۔ نقش اول کے دو صفحے ان موضوعات کے لئے کافی نہیں ہیں میرے خیال میں تو نقش اول کو ہمیشہ کسی خالص ادبی مباحث کے لئے مخصوص ہونا چاہئے، دو صفحے میں اپنے مختلف ادبی مسائل کو آپ ہر مہینے اچھی طرح پیش کر سکیں گے اور اس طرح اپنا ادبی نقطۂ نظر اور اپنے یہاں پیدا ہونے والے مختلف ادبی مباحث آتے رہیں گے جو ہمارے لئے ہر حیثیت سے مفید ہوں گے جیسا کہ ستمبر کے پرچہ میں "ڈرامہ" کے سلسلے میں آپ نے اظہار خیال کیا ہے — ادھر معیار کے مسلسل مطالعہ کے بعد اس بات کا ہمیں اندازہ ہوا کہ آج کل آپ فلسفہ کے مطالعہ میں زیادہ مشغول ہیں اور اس مرتبہ آپ کا "تخلیقی تفکر" مجھے پسند بھی آیا، اسی طرح اگر آپ اپنے فلسفیانہ مطالعہ کو ایک مستقل مقالہ کی صورت میں دیا کریں تو میرے خیال میں یہ زیادہ مفید ہوگا بہ نسبت اس کے کہ آپ اسے "نقش اول" میں لکھیں۔

افسانوں کے سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ اگر "افسانوں" میں خیال کی ندرت نہ ہو تو پھر افسانہ میں کوئی خوبی نہیں رہتی۔ ہمارے بعض افسانہ نگار ایک ہی موضوع اور خیال کو بار بار مختلف انداز سے دہراتے رہتے ہیں۔ اس مرتبہ "ہڑتال نہیں ہوگی" کچھ اسی قسم کا افسانہ ہے۔ حالانکہ ہمارے افسانہ نگاروں کے لئے ہماری سماجی زندگی کے کتنے ہی ایسے گوشے ابھی باقی ہیں جنہیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مرتبہ اسعد گیلانی کا "ماموں حسین علی" ابن فرید کا ترجمہ "فرار" اچھا ہے۔ غزلوں میں ابوالبیان حماد اور انور صدیقی کا تغزل کامیاب ہے خدا کرے "معیار" ہمیشہ معیاری ادب پیش کرتا رہے۔ اور اس کے ذریعہ ہمارے فن کار دین و ادب کی صحیح اور سچی خدمت کر سکیں۔

محمود شاہد

ستمبر کا شمارہ ملا۔ سرسری نظر ڈال کر رکھ دیا تاکہ فرصت میں کچھ دیر معیار کی صحبت میں دلچسپی سے گذرے — سبحان اللہ معیار کی معنوی خوبیوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں جامعہ ملیہ میں کتنے ہی رسائل مختلف خیالات کے آتے ہیں۔ مگر یہاں کی بات ہے کہ جو چیزیں ہمیں معیار میں ملتی ہیں وہ کسی اور رسالہ میں اتنی خوبصورتی اور سنجیدگی کے ساتھ کم نظر آتی ہیں۔

حفیظ صاحب کی زبانی "معیار" کی مشکلات کا تذکرہ سُن کر بے اختیار دل بھر آیا۔۔۔ اس بار نظموں میں زاہد صاحب کی نظم "رات" سہیل زیدی کی "بے عمل" اچھی چیز ہے۔ البتہ زاہد صاحب نے رات کی تیرگی میں جو رویہ اختیار کیا وہ زندگی بخش احساس سے میل نہیں کھاتا۔ بیماری کی موجودگی اور نسخہ کی تجویز تو سمجھ میں آتی ہے مگر دوا حلقوم میں ڈالتے وقت یہ سرد مہری قابل توجہ ہے۔ ؎

بیٹھے بیٹھے میں یوں ہی سوچا کیا سوچا کیا
رات کا رنگ اور گہرا اور گہرا ہو گیا ۔ زاہد

اُمید ڈبائیوی کا حوصلہ اور ان کا تازہ عزم مستحق مبارکباد ہے۔

غزلوں میں حماد صاحب۔ تباز صاحب کامیاب ہیں بالخصوص نیاز کی غزل میں شعریت نے جان ڈال دی ہے۔ عشق و محبت کی رمزوں سے زندگی کی صالح قدروں کو اجاگر کرنے اور دل میں اُتارنے کا یہ انداز بڑا پُر اثر اور پیارا ہے۔ انور صدیقی کی غزل اس لحاظ سے بڑی اچھی ہے کہ اس میں انسان کی عظمت کا احساس ملتا ہے۔ اس کی بے پناہ قوت اور تسخیر مادہ طاقت کا اعتراف نظر آتا ہے۔

شعار عشق انساں سے فروغ بزم عالم ہے
کہا یہ کس نے اپنے حال سے کچھ نہیں ہوتا

جیئے جانے اور زندہ رہنے میں کمال نہیں بلکہ دوسروں کو اسی ولولے اور بھرپور زندگی سے فیضیاب کرنا بڑی انسانیت کی بات ہے ہماری ادبی تحریک کے لئے یہ پہلو زیادہ لائق توجہ ہے۔

ہمیں اس انداز پر نہیں سوچنا چاہیئے کہ موجودہ عہد کی خرابیاں انسان کی عقلی ترقی کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ ان ترقیوں کا ساتھ دے کر ان ہاتھوں کے نقائص کو واضح کرنا چاہیئے۔ اس عہد کی ترقیوں میں اونچا مقام پیدا کرنا کسی تحریک کی زندگی کا ثبوت ہے۔ حیات و کائنات کی عظمت زندگی کی برگزیدگی کو اس کا مقام دلانا اور اسے شعر و ادب میں عام کر کے انسان کے مستقبل کو درخشاں کرنا تعمیری ادب کی بنیادی اساس ہونا چاہیئے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شعر و ادب کو خشک فلسفہ میں بدل دینے کے قائل ہیں۔ بلکہ زندگی اگر فلسفہ ہے جس کا مجھے اعتراف ہے تو اس فلسفہ کو پیکر جمیل عطا کرنا اور اسے شاعری کے نقش و نگار حُسن سے آراستہ کرنا سماج اور شاعری کی بڑی خدمت ہے۔ بغیر مستقبل کا بڑا کام بھی۔

خیال اپنا اپنا

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی ہند رامپور

(۱) مُنّی کتاب :- قیمت - چار آنے

(۲) موتیوں کا ہار :- حصہ اول ۳/ حصہ دویم ۳/ حصہ سویم ۵/

یہ سب کتابیں درسی کتابیں ہیں۔ جن کو افضل حسین ایم اے ایل ٹی نے ایک عظیم تعلیمی تجربہ کے پیش نظر مرتب کیا ہے۔

موصوف اب تک ماہرانہ صلاحیتوں کا اظہار بہت سی درسی کتب کی ترتیب کر کے دے چکے ہیں۔ مندرجہ بالا کتابیں بھی ان کی اعلیٰ تعلیمی کوششوں کی آئینہ دار ہیں۔

پہلی کتاب میں قوت مشاہدہ کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ حروف تہجی کی تعلیم دینے کے لئے جدید ترین طرز پر ایک قاعدہ پیش کیا گیا ہے۔ جو نہ صرف ایک اسلامی درس گاہ کی خدمت ہے بلکہ اردو کی اہم خدمت بھی ہے۔

"موتیوں کا ہار" کے نام سے جو تین چھوٹی کتابیں ہیں ان میں سبق آموزی اور دینی واخلاقی تربیت کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے مواد پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں دلچسپ ہیں۔ جو عام مطالعہ کی کتب کی حیثیت سے معمولی استعداد کی خواتین میں کافی مقبول ہو سکتی ہیں۔

ہم ان سب کوششوں کو سراہتے ہوئے مؤلف کو اس مفید اور عظیم خدمت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور عام حلقوں سے ان کتابوں کی ترویج کی سفارش کرتے ہیں۔

انتخاب کلام راز یزدانی

مرتبہ :- عابد رضا بیدار رامپوری

ملنے کا پتہ :- میکڈانل ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب بیدار نے راز یزدانی صاحب کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ راز صاحب کے یہاں بعض بعض نہایت اچھے شعر ہیں۔ [illegible] بقیہ کلام اوسط درجہ کا ہے۔ البتہ گھٹیا درجے کے اشعار سے یہ مجموعہ پاک ہے۔ راز صاحب اچھی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔

مرتب نے دیباچہ میں [illegible] بڑی جرأت آمیز بات کہدی ہے کہ الہامی [illegible] ہر زندگی کے لئے کوئی معین نظام بنایا جائے تو وہ غزل [illegible] کا نظام ہوگا۔ اچھا ہوتا اگر وہ غزل کے عناصر کا واضح طور سے تجزیہ کر کے کسی نظام کا بنیادی خاکہ بھی پیش کر دیتے۔

جینے کیلئے

مصنف :- ستیہ پال آنند

پبلشر :- ساہتیہ سنگم لدھیانہ۔

ستیہ پال آنند صاحب کے افسانوں کا یہ مجموعہ اکی عمدہ تخلیقی اور فنی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اگرچہ ہمیں ان کے ادبی نظریہ سے اختلاف ہے پھر بھی ہم ان کے بعض افسانوں کو بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن "بھوک" جیسے افسانے ہمارے نظریہ کے لحاظ سے کسی صحتمند مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہی نہیں الٹا مضر ہیں۔ "فسادات" پر جو افسانہ آنند صاحب نے لکھا ہے توازن

سے کہیں کہیں خالی ہو جاتا ہے۔ "کون مون" آنند صاحب کی ایک اچھی تخلیق کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ یہ کردار تنفیا فیڈ ورو ا کے ناول "دی فیملی" کے ایک کردار پروفیسر کرنوف سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن انہیں کرنوف کا تجریدی فکر نہیں ہے اور نہ ہمیں اس کردار پر غیر ملکی رنگ کی چھاپ ملتی ہے۔ اسکے بجائے آنند صاحب کے کردار پر ہندوستانی رنگ چھایا ہوا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ "کون مون" نقل نہیں بڑی حد تک ان کی اپنی تخلیق ہے۔

آنند صاحب نے دیباچہ میں واضح طور سے اپنے نظریہ کو مارکسی بتایا ہے۔ بعض افسانوں کی حد تک یہ صحیح بھی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اکثر افسانوں میں وہ پکے مارکسی کم ہی نظر آتے ہیں۔ شاید ان میں انفرادیت کے کچھ عناصر ابھی زندہ ہیں۔

خاتون نمبر

ماہنامہ "سوداگر" سرائے روڈ۔ کراچی

مرتبین :۔ سلطان احمد۔ جمیل الرحمٰن

قیمت خاتون نمبر

ماہنامہ "سوداگر" کو ہم نے شروع ہی سے ایک اچھے مقصد کا حامل پایا ہے۔ "خاتون نمبر" نکال کر نہ کہ ان "سوداگر" نے نہ صرف اپنی ترتیبی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ دور جدید کے ایک اہم موضوع پر کچھ مفید اور بیش قیمت مواد فراہم کر کے اپنے تعمیری رجحان کا واضح ثبوت بھی پیش کیا ہے۔

"خاتون نمبر" جدیدیت کے فتنے سے خواتین کو آگاہ کرنے اور ان کو ان کا صحیح مقام بتانے کے لئے نکالا گیا ہے۔ یہ کام مقالوں ہی سے نہیں افسانوں، اور نظموں سے بھی لیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ عام حلقوں میں یہ نمبر دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ ہم ادارہ "سوداگر" کو اس پیشکش پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور توقع کرتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ کسی اہم ترین موضوع پر کوئی نمبر پیش کر کے سماج اور ادب دونوں کی خدمت کا عظیم فرض ادا کریں گے۔

سندھی ماہنامہ "نشانِ راہ" والس روڈ

مرتب :۔ مہر عظیم مہر۔ محمد علی پٹو

سالانہ قیمت۔ پانچ روپیہ۔ فی پرچہ آٹھ آنے

یہ ماہنامہ سندھی زبان کا ماہنامہ ہے جس کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ بظاہر ایک اردو رسالہ میں اس کا تعارف عجیب بات ہوگی۔ لیکن نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا تعارف اپنے اندر بڑی افادیت رکھتا ہے۔

اسلامی افکار کو فروغ دینے کی جو ہمہ گیر تحریک اٹھ چکی ہے اور جس کا دائرۂ عمل روز بروز بڑھ رہا ہے اس کے نفوذ کا اندازہ کرنے کے لئے اس رسالہ کا تعارف مفید ہو سکتا ہے۔

یہ رسالہ سندھی زبان میں "اسلامی طرز فکر و عمل جو داعی" یعنی اسلامی طرز فکر و عمل کا داعی کی حیثیت سے نکلا ہے۔ مضامین میں "مذہب پر سیاست" "لئے توحید" "اسلام برسر عمل" "اشتراکیت عالم" "سیرت ہشام" قابل قدر ہیں۔ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا ایک حصہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ حصۂ ادب میں ادارہ نے "اسلامی ادب" کے عنوان سے ایک مختصر تنقیدی مضمون میں اسلامی ادب کا تعارف کرایا ہے۔ اسکے علاوہ ایک افسانہ اور چار نظمیں شامل اشاعت ہیں ظاہر ہے کہ ان سب کا مرکزی فکر اسلام کا نظریۂ ادب ہے۔

اسلامی ادب کی جو تحریک اردو میں شروع ہوئی تھی اب وہ آہستہ آہستہ دوسری زبانوں میں بھی پھیل رہی ہے۔ یہ بات اسلامی ادب کے مستقبل سے بڑی امیدیں بندھاتی ہے۔ ہم اپنے ان قارئین سے جو سندھی ادب کے حلقوں سے روابط رکھتے ہیں یہ درخواست کریں گے کہ اس نئے رسالہ کے فروغ کی کوشش کر کے اسلامی ادب کی ترویج میں حصہ لیں۔